ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۲۸ر دسمبر ۱۹۹۲ء

☆ پسر اقبال کا نفسیاتی مسئلہ کیا ہے؟
☆ قوم پرستی کے مروجہ انسانیت سوز فلسفے
☆ قائداعظم نے "کھوٹے سکے" کسے، کب اور کہاں کہا؟

متحدہ عرب امارات سے بابری مسجد کی شہادت پر غم و غصے کے جارحانہ اظہار کے جرم میں کتنے پاکستانی کارکنوں کا اخراج ہوا اور کس کیفیت میں ہوا ہے، اس پر تو اخبارات میں خبروں اور وضاحتوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے لہٰذا فی الحال کوئی رائے دینا قبل از وقت ہے تاہم ضمنی طور پر سامنے آنے والی اس بات نے مسلمانوں کو چونکا دیا ہوگا کہ یو۔اے۔ای میں مندر بھی تعمیر ہو چکے ہیں۔ خبروں میں بتایا گیا کہ مظاہرین نے جن میں اکثریت پاکستانی مسلمانوں کی تھی، جوش غضب میں ہندوؤں کے دو مندروں کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔

یو۔اے۔ای ایک علیحدہ مملکت سہی لیکن ہے تو جزیرہ نمائے عرب کا ایک حصہ جسے خیر القرون میں بتوں سے پاک کر کے یہ فیصلہ سنا دیا گیا تھا کہ اس خطہ ارض پر ابد الاباد تک کبھی کوئی صنم خانہ آباد نہ ہوگا۔ یوں سعودی عرب میں بھی ہندو کارکنوں کی کمی نہیں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کی حدود میں مندر تو کیا، غیر مسلموں کی کوئی بھی عبادت گاہ تا حال موجود نہیں۔ ہمیں برادر مسلم ممالک کے "داخلی معاملات" میں دخل اندازی کا کوئی حق تو نہیں تاہم مسلم امت ہی کے جگر لخت لخت ہونے کے حوالے سے ہم اپنے یو۔اے۔ای کے حکمران بھائیوں سے یہ درخواست تو کر ہی سکتے ہیں کہ جزیرہ نمائے عرب کا حصہ ہونے کے شرف سے اپنے آپ کو محروم نہ کریں۔ دین سے عملی تعلق ان کا بھی ایسا ہی واجبی سا ہے جیسا ہم پاکستانی مسلمانوں کا لیکن جس طرح ہم اپنے اعزاز پر آج تک فخر کرتے ہیں کہ دنیا کے اس واحد ملک کے باسی ہیں جو اسلام کے نام پر عالم وجود میں آیا، اسی طرح انہیں بھی کم از کم اس اکرام کو تو برقرار رکھنا چاہیے جو جغرافیائی محل وقوع کے سبب سے انہیں از خود حاصل ہو گیا ہے۔○○

قیمت ۵ر روپے

ایک ہفتہ جو مرکزی تربیت گاہ میں گزرا

یہ پروگرام عزم و ارادے کے لئے مہمیز بنا ہے

صادق علی عباسی

گذشتہ دنوں تنظیم اسلامی کے مرکزی دفتر لاہور میں مبتدی رفقاء اور معاونین تحریک خلافت کی ایک مشترکہ ہفت روزہ تربیت گاہ کا انعقاد ۲۰ سے ۲۶ نومبر ۱۹۹۲ء تک ہوا جس میں تمام پاکستان سے تقریباً ۲۲ مبتدی رفقاء اور معاونین تحریک خلافت نے شرکت کی۔ کراچی سے ۴، لاہور سے ۷، راولپنڈی، ملتان، گجرات، رحیم یار خان، صادق آباد، مظفر آباد اور گوجرانوالہ سے ایک ایک، قرآن کالج سے ۳ اور انگلستان سے ایک رفیق جناب ظہور الحسن صاحب تشریف لائے تھے۔

چونکہ تنظیم اسلامی کا مرکزی دفتر لاہور کے گنجان آباد علاقہ میں واقع ہے لہٰذا شرکاء کو کسی قسم کی اجنبیت اور بوریت کا احساس نہ ہوا۔ پہلے دن یعنی ۲۰ نومبر بروز جمعۃ المبارک تربیتی پروگرام کا آغاز امیر محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ، کے مسجد دارالسلام باغ جناح مال روڈ میں خطاب جمعہ سے ہوا۔ اس سلسلے میں رفقاء کو لے جانے اور لانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس خطبہ جمعہ میں ڈاکٹر صاحب نے حالات حاضرہ پر خطاب کیا جس کا عنوان تھا "ملکی سیاست اور تنظیم اسلامی"۔

اس سلسلے میں موجودہ ملکی سیاست اور حالات حاضرہ پر فصیح و بلیغ گفتگو کرتے ہوئے امیر محترم نے فرمایا کہ اس ملک پاکستان کی بقاء اور سالمیت کا دارومدار صرف اور صرف اسلام پر ہے کیونکہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے اور اسے قائم رکھنے کے لئے ہمیں اپنے موجودہ نظام کو بدلنا ہوگا، ان اصولوں پر کام کرنا ہوگا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے ہیں اور جن کو خلافت راشدہ کے دور میں عملی جامہ بھی پہنایا گیا تھا۔

تربیت کے سلسلے میں تمام رفقاء اور معاونین کو تحریک خلافت اور تنظیم اسلامی کی اساس اور اغراض و مقاصد سے تفصیلاً آگاہ کیا گیا جس میں لیکچرز، آڈیو کیسٹ اور وڈیو کیسٹ سے مدد لی گئی تھی۔ روزانہ علی الصبح تہجد کی نماز کے لئے اٹھانے کا کام اقبال میر صاحب نے اپنے ذمے لے رکھا تھا جو نابینا ہیں۔ نماز تہجد کے بعد مسنون دعاؤں کا ورد اور نماز فجر کے بعد تجوید قرآن کے پیریڈ میں قاری صاحب کا دوستانہ انداز اس پیریڈ کو بہت جامع اور موثر بنا دیتا تھا۔

انفرادی اور اجتماعی فرائض دینی کے تصور کے سلسلے میں جو لیکچر جناب رحمت اللہ بٹر صاحب نے دیئے۔ ان میں بہت ہی جرات مندی اور حقیقت پسندی سے کام لیا گیا تھا۔ آج کل دین میں جو خرابیاں اور بدعات شامل کرلی گئی ہیں، ان کی کثافت دل میں شدید سے شدید تر محسوس ہوئی اور فرائض

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

تحریک خلافت پاکستان کو اپنے تاسیسی اجلاس منعقدہ راولپنڈی کے بعد رجسٹریشن کے مرحلے سے گزرنا تھا جس میں ضابطے کی کارروائی نے توقع سے کہیں زیادہ وقت لیا ہے۔ اعلیٰ ترین سطح سے زیریں سطح تک تنظیمی ڈھانچے کی تکمیل اسی پر موقوف تھی لیکن اب الحمدللہ

تحریک خلافت پاکستان

کی بطور ایک سوسائٹی مروجہ قانون کے تحت رجسٹریشن ہوگئی ہے۔

"ندائے خلافت" کے آئندہ شمارے میں تحریک خلافت پاکستان کا وہ دستور اور لائحہ عمل شائع کیا جارہا ہے جسے مذکورہ بالا تاسیسی اجلاس میں منظور کیا گیا اور جو رجسٹرار کے دفتر میں بھی حسب ضابطہ داخل کیا جاچکا ہے ـــــ ادارہ

نا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت لاہور

جلد ۱ شمارہ ۴۷
۲۸ر دسمبر ۱۹۹۲ء

مدیر
اقتدار احمد
معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
مرکزی دفتر: ۶۷۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
مقامِ اشاعت
۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

قیمت فی پرچہ: ۵/- روپے
سالانہ زرِ تعاون (اندرون پاکستان) ۲۰۰/- روپے

زرِ تعاون برائے بیرونِ پاکستان
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت ـــــ ۲۰ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش ـــــ ۱۵ "
افریقہ، ایشیا، یورپ ـــــ ۲۰ "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا ـــــ ۲۴ "

افتتاحیہ

منّتِ این و آں تو چھوٹے گی!

ہمارے کسی بھی وزیر اعظم یا سربراہ مملکت کا کوئی بھی غیر ملکی دورہ آج تک کبھی ناکام نہیں ہوا چنانچہ وزیر اعظم محمد نواز شریف کا دورۂ جاپان اگر کامیاب ثابت ہوا ہے تو اس میں کوئی نئی خبر نہیں بلکہ ان کے وفد میں شامل وزیر داخلہ چودھری شجاعت حسین کی یہ تصدیق تو پاکستانیوں کے دلوں کو باغ باغ کر گئی کہ اس دورے کی کامیابی نے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ کر رکھ دیے ہیں۔ ان کی اس تصریح سے ایمان کو بھی تازگی ملی ہے کہ گذشتہ جنوری میں وزیر اعظم کے دورے کی اچانک اور حادثاتی منسوخی میں ہمارے رب کی رضا و منشاء شامل تھی کیونکہ جو فائدہ اب دسمبر میں ہوا' وہ گیارہ مہینے پہلے ممکن ہی نہ تھا۔ وزیر اعظم مشرق کی جانب خشکی کی آخری حد تک ملک و قوم کی نمائندگی کرنے تشریف لے گئے تھے' انہیں اگر اکرام ملا تو ہماری عزت افزائی ہوئی ہے جس پر ہم سے زیادہ خوش کون ہوگا!۔ قومی مفادات کے حق میں وہ منزلیں مارتے آگے بھی بڑھتے لیکن کیا کرتے' اللہ میاں کی زمین ہی ختم ہو گئی اور بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑا دینے کا اب زمانہ نہیں رہا۔

خدا لگتی بات یہ ہے کہ ایک ایسے ملک کی آدھی تیتر آدھی بٹیر حکومت کی نمائندگی اس سے بہتر ممکن بھی نہ تھی جو داخلی تضادات کا ایک شاہکار الگ ہے اور قلب و ذہن کی ایک دائمی کشمکش کی شکار الگ۔ ایماں اسے روکے ہے تو کھینچے ہے اسے کفر۔ خود انحصاری اور کشکول توڑ کر پھینک دینے کی ہانک تو خیر شاعرانہ تعلی تھی اور ضروری نہیں کہ حرف بحرف اس پر عمل بھی کیا جائے اور قرضے لینے والی قوم کی بجائے قرض دینے والا ملک بن جانے کا دعویٰ بھی مقطع میں آپڑنے والی ایک سخن گسترانہ بات یا بہت سے بہت' عزائم کی بلندی کا اظہار تھا جن کے پورا ہونے سے پہلے ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے رکھنا کچھ بہت معیوب نہیں کہ ہم ۴۵ سال بعد بھی حالات اضطرار سے نکل نہیں سکے ہیں لیکن اصل مشکل تو ایٹم بم سے سہمی ہوئی جاپانی قوم کو اس امر کی یقین دہانی تھی کہ ہمارے "بم" کی ہوائی کسی دشمن کی اڑائی ہوئی ہے اور اصل مسئلہ پیسے یا ین کا حساب رکھنے والے کاروباریوں کو یہ تسلی دینا تھا کہ سود کی بندش میں ہمارا اپنا بھی زیاں ہے' زبانی جمع خرچ سے آپ لوگ ہراساں نہ ہوں جو ہمارا دفع الوقتی کا مشغلہ ہے!۔ اور وقت ہی بتائے گا کہ جاپان کو اپنی باتوں سے شیشے میں اتارنے کی کوشش میں ہم کس حد تک کامیاب ہوئے ہیں تاہم سب سے بڑا اور مستقل سوال تو یہ ہے کہ منت این و آں سے ہماری جان آخر کب چھوٹے گی!

موجودہ حکومت جس منشور کے بل پر برسر اقتدار آئی ہے اس میں جو ہری پروگرام کو منطقی انتہا تک پہنچانے یعنی ایٹمی دھماکہ کرنے اور اپنے ازلی دشمن بھارت کو اس کی کھال کے اندر رکھنے کی غرض سے اعلانیہ ایٹم بم بنانے کا وعدہ صرف اس شرط سے مشروط ہے کہ ہمارے عزائم جارحانہ نہیں' مدافعانہ ہیں۔ اس وعدے کے ضمن میں حکومت اپنے عوام کے سامنے جوابدہ ہے' جاپان اور اقوام مغرب کے سامنے نہیں۔ بایں ہم یہ عذر بدتر از گناہ نہ تھا کہ اگر بھارت بھی تائب ہو جائے اور این پی ٹی یعنی ایٹمی ہتھیاروں کے "عدم پھیلاؤ" کے معاہدے پر دستخط کر دے تو ہماری طرف سے بھی صاد ہے' ہم پرانے تیر و تفنگ سے ہی اپنے اس دشمن کا مقابلہ کر لیں گے کہ نئے ساز و سامان کے لئے دفاعی اخراجات بھی طبع نازک پہ گراں ہیں' لیکن ہمیں غیر مبہم انداز میں بتا دیا گیا ہے کہ بھارت جانے اور ہم جانیں' تم اپنی بات کرو! کچھ ایسی ہی دشواری ہمیں سود کے معاملے میں پیش آ رہی ہے۔ نفاذ اسلام تو خیر کسی انقلاب کے بغیر ممکن ہی نہیں' نفاذ شریعت بہرصورت ایک بالکل متعین انتخابی وعدہ تھا اور شریعت کو چاہے کتنا ہی توڑ مروڑ لیا جائے اس میں سے مروجہ سودی مالیاتی نظام کی گنجائش نہیں نکالی جا سکتی۔ دوسرے معاملات سے قطع نظر' یہی دو مسائل بڑے سے بڑے فتنے کو جگا سکتے ہیں اور اڑتی ہی اک خبر ہے زبانی طیور کی کہ "وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا"۔ دیکھا دیکھی مذہبی و دینی (سیاسی) جماعتیں بھی حکومت کے خلاف صف بندی کر ہی رہی ہیں جو انہی دو "گگلیوں" سے سرکار کی "وکٹ" اڑائیں گی۔

پس چہ باید کرد؟۔ اس مخمصے کا حل صرف ایک ہے' قوم کو ایک واضح سمت دیجئے اور پھر نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ سے بے نیاز ہو کر صحیح معنوں میں خود انحصاری کا رویہ اپنایئے۔ اسی طرح گھر کے کواڑ بند کر لیجئے جیسے اپنے واحد معاون و مربی سرخ روس کے نخروں سے تنگ آنے کے بعد ماؤ کے چین نے اسے بھی دھتا بتا کر کئے تھے۔ یا پھر برادر مسلم ملک سوڈان سے سبق لیجئے جو ایک باوقار مسلم قوم کے سے تیور اپناتا نظر آ رہا ہے۔ افسوس کہ اپنے مسلمان بھائیوں کے احوال جاننے کے لئے بھی ہم مغربی ذرائع ابلاغ کے محتاج ہیں جنہوں نے ہمیں سوڈان کی موجودہ کیفیت سے بے خبر بلکہ بدگمان رکھا ہوا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہاں نئی قیادت گذشتہ چند برسوں سے قوم کو زندگی کا وہ قرینہ دے رہی ہے جو کسی اور مسلم ملک کے لئے ہو نہ ہو' ہمارے لئے ضرور ایک قابل تقلید مثال ہے کیونکہ یہ سلیقہ انہوں نے اسلام ہی سے مستعار لیا ہے جو ہمارا بھی اوڑھنا بچھونا ہے۔○○

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الہدیٰ

سورۃ البقرہ
(آیات ۱۴۵ تا ۱۴۷)

ترجمانی: حافظ عاکف سعید

اگر تم لاؤ اہل کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں تو بھی یہ تمہارے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے' اور نہ تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے والے بن سکتے ہو اور نہ ان میں سے بعض پیروی کرنے والے بن سکتے بعض کے قبلے کی'

(کہ یہ واضح ہوجانے کے بعد کہ قبلے کے معاملے میں اہل کتاب کا یہ مخالفانہ طرز عمل کسی شک و شبہ کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ یہ سب کچھ محض ضد' تعصب اور ہٹ دھرمی کے باعث ہے' تم اس بات کی توقع مت رکھو کہ یہ تمہارے قبلے کی پیروی کریں گے۔ اگر آپؐ انہیں دنیا جہان کے معجزے دکھادیں تب بھی یہ آپؐ کے قبلے کی پیروی پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ ان کو مطمئن کرنے والی کوئی چیز اگر ہو سکتی ہے تو بس یہی کہ تم لوگ ان کے قبلے کی پیروی شروع کردو۔ لیکن تحویل قبلہ کا یہ حکم چونکہ ایک مستقل حکم کا درجہ رکھتا ہے لہٰذا تمہارے لئے اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا کہ تم ان کے قبلے کی پیروی کرنے لگو--- اور یہ تم سے اس امر کا تقاضا کیونکر کرتے ہیں حالانکہ قبلے کے تعین کے معاملے میں یہ لوگ خود متحد نہیں ہیں۔ یہود صخرہ بیت المقدس کو اپنا قبلہ سمجھتے ہیں جبکہ نصاریٰ بیت المقدس کی مشرقی جانب کو اپنا قبلہ قرار دیتے ہیں اور ان کا یہ باہمی جھگڑا صدیوں سے چلا آرہا ہے جو آئندہ بھی حل طلب ہی رہے گا!)

اگر تم نے پیروی کی ان کی خواہشات کی' اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے' تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہوجاؤ گے○

(کہ وحی کے نازل ہونے اور حق کے واضح ہوچکنے کے بعد اگر بفرض محال ان کے پراپیگنڈے سے متاثر ہوکر یا ان کی دلجوئی کی خاطر آپ نے ان کی بات مان لی تو آپؐ کا شمار بھی ظالموں میں ہوگا۔ یہاں خطاب اگرچہ ظاہراً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس تختی کا اصل رخ یہود کی جانب ہے کہ یہ حقیقت پورے طور پر منکشف ہوچکنے کے بعد کہ خانہ کعبہ ہی ملت ابراہیمی کا اصل قبلہ ہے' پھر بھی اگر کوئی حق بات سے منحرف ہوگا تو یقینی طور پر اس کا شمار ظالموں ہی میں ہوگا)

جن کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ اسے پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں' اور یقیناً ان میں ایک گروہ ہے جو حق کو چھپاتا ہے جانتے بوجھتے○ یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے' تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا○

(کہ اے نبیؐ آپ اس معاملے میں ہرگز کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ یہود آپؐ پر ایمان کیوں نہیں لاتے اور آپؐ کے قبلے کی پیروی کیوں نہیں کرتے' حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے سچے نبی ہیں اور قرآن اللہ کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اپنے بیٹوں کو پہچاننے میں جیسے انسان سے خطا نہیں ہوتی اسی طرح آپؐ کو پہچاننے میں انہیں کوئی مشکل درپیش نہیں ہوئی۔ آپؐ مطمئن رہئے آپ ہی حق پر ہیں اور یہی لوگ ہیں جو گرفتارِ ضد اور عناد ہیں!)

قوم پرستی کے مروجہ انسانیت سوز فلسفے

اصل ایٹمی دھماکہ مکہ باہمی منافرت ہے

عبدالکریم عابد

کانگریس کی پاکستان دشمن پالیسی نے ہندو فرقہ واریت کو پروان چڑھایا

سچے مذہبی لوگ دونوں طرف فرقہ واریت کے خلاف کامیاب جہاد کرسکتے ہیں

برصغیر میں مسلم قوم پرستی اور ہندو قوم پرستی کی جنگ نے آزادی کے تمام ثمرات کو ضائع کرایا۔ لاکھوں بے گناہوں کا قتل عام' ہزارہا ہزار عورتوں کا اغوا' راس کماری سے پشاور تک خانماں برباد خاندانوں کی مہاجرت' بھارت میں آئے دن کے فرقہ وارانہ فسادات' پاکستان اور بھارت میں تعاون کی بجائے کشیدگی اور نفرت کے ماحول میں وسائل کا اسلحہ بندی اور فوجی بجٹ میں ضیاع' تعصب اور تنگ نظری کی ذہنیت کا فروغ اور ایک طرف پاکستان دشمنی اور دوسری جانب بھارت دشمنی کے نعروں کی آڑ میں عوام کو بے وقوف بنانے اور ان کی توجہ حقیقی مسائل سے ہٹانے کی سیاست' یہ سب کچھ وہ ہے جس نے صبح آزادی کو شام غریباں میں تبدیل کر دیا ہے اور جن شاعروں نے کہا تھا کہ یہ صبح وہ نہیں ہے جس کا کہ انتظار تھا تو انہوں نے صحیح کہا تھا کیونکہ اس صبح آزادی میں جمہوریت کی جگہ آمریت تھی۔

بھارتی جمہوریت کے متعلق بھی اب ثابت ہوگیا کہ یہ جمہوریت کا سوانگ تھا جس سے بھارت منور نہیں ہوا بلکہ تاریک تر ہوگیا ہے۔ معاشی طور پر دونوں ملکوں کے بجٹ کا بڑا حصہ جنگی تیاریوں کی نذر کرنے کے بعد تعلیم' صحت' زراعت اور صنعت کی ترقی کیلئے سرمایہ کا فقدان رہا اور ادھر ادھر سے بھیک مانگ کر جو سرمایہ لیا گیا' وہ بھی کسی کام نہیں آیا۔ آج کا بھارت آزادی سے پہلے کے بھارت سے زیادہ غریب ہے اور اس کی یہ غربت بہت المناک ہے جبکہ پاکستان کی معاشی حالت نسبتاً بہتر رہی کیونکہ ہمیں قرض پر رنگ رلیاں منانے کا موقع مل گیا تھا لیکن اب اقتصادی مسائل کا ہولناک عفریت منہ کھولے ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔

آزادی سے پہلے کے معاشرہ میں علمی سرگرمیوں' فکری تحریکوں' ادبی کاوشوں' تعلیمی سرگرمیوں اور سیاسی تنظیموں کے سبب نئے آدرش اور نصب العین دلوں میں حرارت پیدا کرنے لگے تھے' پرانی غلط رسومات کے بندھن ٹوٹنے لگے اور جدید کی جانب پیش قدمی کے باوجود قدیم تاریخ اور اقدار سے بھی رشتہ برقرار رکھا گیا تھا۔ گاندھی کی اصلاحی تحریک نے ہندو معاشرہ میں حب الوطنی' سادگی چھوت چھات سے نجات' انگریز سے مقابلے کا حوصلہ اور اخلاقی اقدار کا احساس پیدا کیا جبکہ مسلمانوں میں تحریک خلافت نے ٹوڈی سیاست کی جگہ نئی مجاہدانہ سیاست کو فروغ دیا' پان اسلام ازم کے نظریات دلوں میں گھر کر گئے' مسلم لیگ نے کل ہند سطح پر مسلمانوں کو منظم و متحد کر کے نئی طاقت بنا دیا اور جماعت اسلامی نے اسلامی نظام کے تصور پر مبنی ایسا لٹریچر پیدا کیا جس نے مسلمانوں کو الحاد اور مذہبیت سے بچایا اور احیائے اسلام کی وہ تحریک پیدا کی جو بقیہ عالم اسلام پر بھی اثر انداز ہوئی۔ اس کے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوتا رہا لیکن ہندو قوم پرستی اور مسلم قوم پرستی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک صدی سے زائد کی جدوجہد پر پانی پھیر دیا ہے' تمام اصلاحی تحریکوں کے نتائج ملیا میٹ ہوگئے اور آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے کی جانب سفر شروع ہوگیا ہے اور اس سفر میں بابری مسجد کے انہدام کا مرحلہ آخری مرحلہ نہیں کیونکہ ٹکراؤ اور تباہی کی جانب برصغیر کی پیش قدمی مسلسل جاری ہے۔

ایک مغربی تجزیہ نگار نے کہا کہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد اب ایٹم بموں کے استعمال کا نیا میدان برصغیر ہوگا اور برصغیر کو اس انجام سے بچایا نہیں جا سکے گا۔ صرف ہندو قوم کے چہرے کو مکروہ سمجھنے والے اپنی مسلم قوم پرستی کے چہرہ کو بھی دیکھ لیں۔ بابری مسجد کے انہدام پر غم و غصہ بجا تھا لیکن پاکستان میں ایک سو سے زائد مندروں کو تباہ کرنے کا کیا جواز ہے جبکہ بیشتر مندروں میں پوجا بھی نہیں ہوتی تھی اور ان میں ۱۹۴۷ء کے بے خانماں مہاجرین آباد تھے جن کو پھر بے خانماں کرایا گیا ہے اور ان مندروں کے ملبہ میں دب کر کئی مسلمان ہلاک بھی ہو گئے۔ لورالائی کے علاقہ میں ایک ہندو خاندان کو زندہ جلا دینا بھی مسلم قوم پرستی کے جذبہ کے تحت تھا' اسلامی جذبہ کے تحت نہیں تھا کیونکہ اسلام ایک بے گناہ انسان کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل سمجھتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کو تو حالت جنگ میں بھی ہاتھ لگانے کی اجازت نہیں لیکن لورالائی میں عورتیں اور بچے بھی شعلوں کی نذر ہوگئے۔ یہ وحشت اور بربریت کوئی بھی مذہب نہیں سکھاتا البتہ قوم پرستی کی شریعت میں یہ گھناؤنے مظالم جہاد کا درجہ رکھتے ہیں اور بابری مسجد کے انہدام سے اس وحشیانہ قوم پرستی کا برصغیر میں نیا مقابلہ شروع ہوگیا ہے جس کا انجام' خاص طور سے ہندوستانی مسلمانوں کیلئے بہت تباہ کن

ہے وہ نہ تو منظم ہیں نہ ان کی پشت پر کوئی طاقت ہے۔

مسئلہ برابر کی جنگ کا نہیں ہے' اکثریت اور اقلیت سے قطع نظر بھارتی ریاستی ملٹری اور پولیس کے دل ہندو فرقہ پرستوں کے ساتھ ہیں اور وہ ہر موقع پر مسلمانوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں جبکہ ہندو فرقہ پرستوں کو تقویت فراہم کرتے ہیں۔ پھر ہندو فرقہ پرستوں نے پچھلے چند سالوں میں اپنے آپ کو ہر سطح پر اور ہر علاقہ میں منظم کر لیا ہے۔ جنوبی ہند میں بھی جہاں ان کا اثر نہیں تھا' اب یہ ایک طاقت بن گئے ہیں۔ مغربی بنگال میں کیمونسٹ حکومت کیلئے یہ خطرہ بن گئے ہیں۔ بمبئی اور مہاراشٹر میں شیوسینا کا راج ہے' مجال نہیں کہ کوئی ان کی راہ میں مزاحم ہو۔ بھارتیہ جنتا پارٹی تھی لیکن اب میدان اس کے ہاتھ سے نکل کر ایک اس سے بھی زیادہ متعصب اور فرقہ پرست جماعت وشوا ہندو پریشد کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے۔

راشٹریہ سیوک سنگھ بے مثال طور پر منظم ہے' ایسی تنظیم برصغیر میں اور کوئی نہیں۔ اس نے ہر شہر اور گاؤں میں ورزش کے اکھاڑوں کے نام پر تربیتی مراکز قائم کر رکھے ہیں جہاں مرنے مارنے اور فساد کرنے کے تمام طریقے سکھائے جاتے ہیں۔ اس کے رضاکار لاکھوں میں ہیں۔ بھیانک شکل کے ہندو جوگیوں کا ایک سیلاب ہے جو ٹرکوں پر رواں ہے یہ جوگی اور سادھو ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگائے ملتے ہیں اور ہندو آبادی میں اشتعال پھیلانے کے کام پر مامور ہیں۔ انہیں سرمایہ ہندو سیٹھوں ساہوکاروں سے حاصل ہوتا ہے۔ خاص طور پر سندھی سرمایہ دار بے پناہ پیسہ ان کیلئے خرچ کر رہا ہے۔

اس وقت ہندوستان کے بڑے بڑے سرمایہ دار خانوادوں میں سندھی خانوادے نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ ایڈوانی بھی سندھی ہیں۔ سندھی صنعت کاروں اور تاجروں کے علاوہ ان کا دانشوروں کا گروہ بھی ہے جو فکری اور صحافتی محاذ پر جنگ آزما ہے۔ ان دانشوروں نے ستی کی پرانی رسم کی حمایت میں مضامین لکھے جس کے نتیجے میں کئی عورتیں ستی ہوئی ہیں۔ اس قبیح رسم کی روک تھام کیلئے قانونی مشینری کو حرکت میں آنا پڑا ہے۔ شرنارتھی جب پاکستانی علاقہ سے ہندوستان میں پہنچے تو پہلے دن سے وہ ہندو تعصب کے علمبردار بن گئے جبکہ مقامی ہندو پہلے ہی اس رنگ میں رنگے جا چکے تھے۔ شرنارتھیوں نے گویا جلتی پر تیل چھڑکا۔

ہندو فرقہ پرستی کی سیاسی صورت حال ابھی چند سال پہلے یہ تھی کہ پارلیمنٹ میں بی جے پی کے صرف تین رکن تھے لیکن نئے الیکشن کے بعد تقریباً ایک سو ہو گئے اور کئی صوبوں میں ان کی حکومتیں قائم ہو گئیں۔ آج بی جے پی کے مقابلہ میں کانگریس یا کیمونسٹ پارٹیوں کی کوئی حیثیت نہیں' وہ انتخابی طاقت بھی ہیں سٹریٹ فورس بھی۔ نئے انتخابات میں مرکز پر اپنا مکمل قبضہ کر لیں گے۔ بی جے پی نے یہ طاقت کانگریس سے حاصل کی کیونکہ کانگریس کا ہندوستانی نیشنلزم اصل میں ہندو نیشنلزم تھا۔ جنومنو کے گیت' رگھوپتی راجہ رام کے ترانے' جھنڈے میں اشوک کا چکر' پاکستان کے خلاف زہر میں بجھی باتیں اور سری لنکا' نیپال' مالدیپ سے لے کر کابل اور انڈونیشیا تک وسیع و عریض پراچین بھارت کے خواب۔ یہ دراصل ہندو نیشنلزم تھا جس کے رد عمل نے مسلم نیشنلزم کو پیدا کیا اور عمل' پھر رد عمل کے شیطانی چکر میں برصغیر ایسا پھنسا ہے کہ نکلتا نظر نہیں آتا اگر کہیں ہندو نیشنلزم یا مسلم نیشنلزم کچھ عرصہ کیلئے پیچھے چلا جاتا ہے تو اس کی جگہ علاقائی لسانی نیشنلزم آ کر نیا فتنہ برپا کرتا ہے اور پرانا فشار بھی اپنی جڑ نہیں چھوڑتا۔

جو کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے وہ پاکستان میں جنون پیدا کرتا ہے اور پاکستان کے واقعات بھارت میں دیوانگی کو اور ہوا دیتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ اعتدال اور توازن کی سوچ رکھنے والوں کا فقدان ہے' یہ بہت ہیں مگر بے بس ہیں۔ بھارت میں بڑے بڑے دانشور ہیں جنہوں نے بابری مسجد کے اس قضیہ میں ہندو فرقہ پرستی کے علی الرغم کھڑے ہو کر جرأت مندانہ باتیں کی ہیں اور علم منطق اور استدلال کو سامنے رکھا ہے۔ کئی ہندو دانشوروں نے تاریخی طور پر ثابت کیا کہ بابری مسجد کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔ کئی ہندو مورخین نے یہاں تک کہا کہ راجہ رام چندر ہندوستان میں پیدا نہیں ہوئے تھے' وہ افغانستان کے باشندے تھے اور آریہ جب شمال سے آئے تو رام کی داستانیں اپنے ساتھ لائے تھے۔

ابھی چند ماہ پہلے بھارت کی ہسٹاریکل سوسائٹی کے ایک رکن پروفیسر راجیش کوچر کا ایک مضمون السٹریٹیڈ ویکلی آف پاکستان میں شائع ہوا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ بارہ سال تک یہ تحقیقات کرتے رہے' تمام مقامات کی سیر کی' آثار قدیمہ کو دیکھا پرکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ رامچندر جی کی جائے پیدائش افغانستان کا صوبہ ہرات ہے۔ وہ نسلی طور پر پٹھان تھے۔ راجیش کوچر ایک بلند پایہ ویدک سکالر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رامائن میں جو مقامات بیان کئے گئے ہیں' وہ سب افغانستان میں ہیں۔ اجودھیا کا شہر تو آٹھ سو سال قبل مسیح کا ہے جبکہ مہابھارت کی جنگ ایک ہزار سال قبل مسیح کی بات ہے اور رام چندر جی مہابھارت سے بھی پہلے کے ہیں۔ ان کا عہد پندرہ سو سال قبل مسیح کا ہے۔

بعض دوسرے ہندو محققین مثلاً ڈاکٹر ایس بی رائے اور حکومت ہند کی کیلنڈر ریفارم کمیٹی کے سربراہ ایم این شاہ کا بھی یہی خیال ہے کہ رام ہندوستانی نہیں تھے۔ رگ وید کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ یہ کتاب ہندوستان سے باہر کی ہے اور زرتشتی مذہب کی کتاب "اوستا" سے ملتی جلتی ہے۔ دونوں میں کئی الفاظ مشترک ہیں اور دونوں میں مفہوم و معانی کے اعتبار سے بھی حیرت انگیز مماثلت ہے جس کی ایک مثال یہ ہے کہ رگ وید میں ایک جگہ بتائی گئی ہے جہاں مکھیاں بہت ہیں۔ اوستا میں مکھی کو "مگس" کا نام دیا گیا اور رگ وید میں "مکش" کہا گیا۔

یہ تو طے ہے کہ آریہ خود غیر ہندوستانی تھے' باہر سے آئے تھے۔ اصل ہندوستانی تہذیب موہنجوداڑو ہڑپہ کی تہذیب ہے۔ آریوں نے حضرت عیسٰی سے ۲۰۰۰ء تا ۱۵۰۰ء قبل مسیح پاکستانی علاقہ میں آ کر ڈراویڈن کو جنوب میں دھکیل دیا اور اس زمین پر قابض ہو گئے اور پھیلتے چلے گئے۔ وہ باہر سے اپنے مذہبی تصورات اور بت بھی لائے تھے۔ یہی بت یورپ میں جرمنی وغیرہ میں بھی ملے ہیں کیونکہ آریاؤں کی ایک شاخ یورپ چلی گئی تھی۔ اب ہندو فرقہ پرستوں نے بھارت کی نئی تاریخ کھولنے کا اہتمام کیا ہے اس میں ثابت کیا جائے گا کہ آریاؤں کے باہر سے آنے کا پروپیگنڈہ انگریزوں نے کیا تھا ورنہ وہ یہیں کے تھے' باہر سے نہیں آئے تھے۔ تاریخ کو اس طرح مسخ کرنے کیلئے بی جے پی کی لابی حکومت نے ایک بورڈ قائم کیا تھا جس پر مورخین نے احتجاج تو کیا ہے۔

بھارتی سیاسی رہنماؤں میں وشوناتھ پرتاپ سنگھ اور جنتا دل کے دوسرے لیڈروں نے ہندو فرقہ واریت کے مقابلہ میں مضبوط رویہ کا مظاہرہ کیا جبکہ اندرا اور راجیو نے اپنے دور حکومت میں سیاسی مصلحتوں کے تحت ہندو فرقہ واریت سے ساز باز کئے رکھی۔ اندرا نے ایک ہندو دیوی کا روپ دھار لیا تھا

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

تین سو سال سے ہند کے "میخانے" بند تھے

فکر اقبال کی تعمیل کی تاریخی اہمیت

ڈاکٹر اسرار احمد

(نوائے وقت کے شکریئے کے ساتھ)

۲۱ر اکتوبر کی رات کو نو بجے کے کچھ ہی بعد میری والدہ صاحبہ محترمہ اکانوے برس کی عمر میں تقریباً چار ماہ صاحب فراش رہ کر دنیا کی اس عارضی قیام گاہ سے آخرت کے مستقل گھر کو روانہ ہو گئیں۔ اور اس طرح ہمارے سروں سے اللہ کی رحمت کا ایک سایہ اٹھ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ قارئین "نوائے وقت" سے استدعا ہے کہ ان کے لئے مغفرت اور ترقی درجات کی دعا فرمائیں۔ طبیعت پر اگرچہ فطری طور پر گہرا اثر ہے تاہم ارادہ ہے کہ ان کالموں کا جو سلسلہ صرف احقاق حق اور ابطال باطل کی نیت سے شروع کیا گیا ہے اس میں حتی الامکان ناغہ نہ ہو۔ بیدہ التوفیق و علیہ الکلان!

سب جانتے ہیں کہ انقلاب فرانس کو فکری غذا والٹیئر اور روسو اور بعض دیگر مصنفین نے فراہم کی تھی' تاہم اس کی عملی جدوجہد میں ان میں سے کسی کا کوئی حصہ نہ تھا۔ اسی طرح انقلاب روس کے لئے فکری مواد مارکس اور اینجلز نے جرمنی اور انگلستان میں بیٹھ کر تیار کیا تھا' تاہم اشتراکی انقلاب بالفعل روس میں لینن کی قیادت کے ذریعے برپا ہوا---- خود مسلمانوں کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ دور صحابہؓ کے بعد سوائے ایک امام ابن تیمیہؒ کے جتنے لوگ علم و فکر اور قلم و قرطاس کے میدان میں نمایاں ہوئے ان میں سے کوئی بھی سیف و سناں کا حامل نہ ہوا۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری کے مجدد اعظم امام ابو حنیفہؒ نے بھی اگرچہ حضرت نفس زکیہؒ کی اخلاقی تائید بھی کی اور ان کے ساتھ مالی تعاون بھی کیا لیکن عملاً جہاد و قتال میں شرکت نہیں کی۔ اسی طرح امت کی تاریخ کے دوسرے ہزار سالہ دور (الف ثانی) کے آغاز پر دو عظیم ترین مجددوں یعنی شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی مساعی بھی صرف قلم و قرطاس کی خدمت یا باطنی اور روحانی اصلاح تک محدود رہیں۔

علی ہذا القیاس' اگر علامہ اقبال مرحوم نے بھی صرف اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کا کارنامہ سرانجام دیا اور خود عملی طور پر نہ کسی تحریک کا آغاز کیا نہ کسی جماعت کی تاسیس کی تو اس میں ہرگز نہ کوئی تعجب کی بات ہے' نہ ہی اس سے ان کی ذات اور شخصیت پر کوئی حرف آتا ہے۔ اس لئے کہ جس طرح گذشتہ صدی کی عظیم تحریک مجاہدینؒ فی الواقع شاہ ولی اللہؒ ہی کی تجدیدی مساعی کا ظہور تھی' اسی طرح اگر ذرا بنظر غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ بیسویں صدی عیسوی کی جملہ احیائی مساعی کی بنیاد میں بھی علامہ اقبال ہی کا فکر کار فرما ہے۔ اور اگر اللہ کو منظور ہوا اور سلطنت خداداد پاکستان اسلام کی "نشاۃ ثانیہ" کا گہواہ اور عالمی نظام خلافت علیٰ منہاج النبوت کا نقطہ آغاز بنی' اور اس کے لئے یہاں منہج نبویؐ پر کوئی انقلاب برپا ہوا' جس کے تاریخی شواہد بہت قوی ہیں (اگرچہ موجود الوقت احوال و کیفیات کی بنا پر گاہ بگاہ مایوسی اور بددلی کے آثار بھی پیدا ہو جاتے ہیں!) تو اس کی اصل اساس علامہ اقبال کے اسی "کارنامے" پر ہوگی جو انہوں نے اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید کی صورت میں سرانجام دیا---- تاہم اس حقیقت کے کماحقہ ادراک کے لئے ضروری ہے کہ پہلے علامہ مرحوم کی شخصیت کو تاریخ کے فریم میں فٹ کر لیا جائے۔

علامہ اقبال کی ولادت ۱۸۷۷ء میں اسی سال ہوئی جس سال مسلم انڈیا میں ایک نئی فکری اور سیاسی روایت کے بانی سرسید احمد خان کے ہاتھوں ایم اے او کالج علی گڑھ کی تاسیس ہوئی۔ پھر علامہ کی شاعری کا آغاز لگ بھگ اس وقت ہوا جب سرسید کی زندگی کا چراغ گل ہوا چاہتا تھا۔ سرسید کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا اور علامہ اقبال اگرچہ لاہور کے حلقہ شعر و ادب میں تو ۱۸۹۵ء ہی سے متعارف ہو چکے تھے تاہم ان کی وہ پہلی نظم جس کے ذریعے وہ ہندوستان کے وسیع تر علمی و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے "ہمالہ" ہے جو اپریل ۱۹۰۱ء میں آنریبل سر عبدالقادر کے ماہنامے "مخزن" کی پہلی اشاعت میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ کا پہلا اردو مجموعہ کلام "بانگ درا" شائع ہوا تو اس کا "دیباچہ" بھی ان ہی سر عبدالقادر نے لکھا جس میں انہوں نے علامہ کی شاعری کو بجا طور پر تین ادوار میں منقسم قرار دیا (واضح رہے کہ "بانگ درا" سے قبل علامہ کے فارسی کلام پر مشتمل تین کتابیں شائع ہو چکی تھیں' یعنی ---- اسرار خودی ۱۹۱۵ء میں' رموز بیخودی ۱۹۱۸ء میں' اور پیام مشرق ۱۹۲۳ء میں!)

علامہ کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء تک ہے جس میں وہ زیادہ تر حالی کی "نیچرل شاعری" کے انداز میں انگریزی شعراء کا اتباع کرتے' اور ہندی قومیت کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں۔ دوسرے دور میں (۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء) وہ اردو اور فارسی شاعری کے روایتی مضامین یعنی گل و بلبل' حسن و عشق' اور فراق و وصال کی دشت پیمائی کرتے نظر آتے ہیں ------ لیکن ۱۹۰۸ء میں جیسے ہی ان کی حیات مستعار کی چوتھی دہائی کا آغاز ہوتا ہے' ان کی "ملی شاعری" کا دور بھی بھرپور انداز میں شروع ہو جاتا ہے۔ اور اب وہ مسلمانوں کی وحدت ملی کے ترانے گاتے' اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی پر آنسو بہاتے' لیکن ساتھ ہی ان دونوں کے احیاء اور عروج نو کی نوید جانفزا سناتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے پہلی دونوں حیثیتوں میں وہ شبلی اور حالی کی روایت کے تسلسل کی حیثیت رکھتے ہیں (جو خود اپنی جگہ آسمان سرسید ہی کے ستارے تھے)------ لیکن تیسری حیثیت میں' یعنی اسلام کے احیاء و تجدید کے علمبردار اور مسلمانوں کے عروج نو کے مبشر اور نقیب ہونے کے اعتبار سے وہ بالکل "منفرد" بھی ہیں اور ایک نئے دور کے "فاتح" یعنی افتتاح کرنے والے بھی!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ بنیادی طور پر ایک مفکر و مصور اور حکیم و دانا انسان تھے' لہٰذا فکر اور فلسفہ کی سطح پر انہوں نے جن بلندیوں کو چھوا'

اور جس وسعت نظر کا ثبوت دیا' اور اس سے بھی بڑھ کر " آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر" نہ صرف خود دیکھی بلکہ دوسروں کو بھی دکھائی اس کے مقابلے میں عمل کے میدان میں ان کا مقام زیادہ بلند اور نمایاں نظر نہیں آتا۔ تاہم انہوں نے مسلمانان ہند کو اپنے جداگانہ قومی تشخص کا احساس و شعور عطا کرنے میں جو عظیم کامیابی حاصل کی۔ (اس اعتبار سے راقم الحروف کے نزدیک وہ مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے ظل اور بروز کی حیثیت رکھتے ہیں۔) اور اس سے بھی بڑھ کر ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد کے ذریعے ان کی قومی جدوجہد کے لئے جو منزل مقصود اور نصب العین معین کیا' اور ان سب پر مستزاد مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں جس طرح ایک عام کارکن کی طرح حصہ لیا' اس کے پیش نظر وہ عمل کے میدان میں بھی بالکل خالی ہاتھ نہیں ہیں اور پاکستان کے قیام میں ان کا حصہ کسی دوسرے قائد سے ہرگز کم نہیں ہے!

لیکن دوسری جانب احیاء دین اور " طلوع اسلام" کا جو زبردست صور انہوں نے پھونکا تھا برعظیم پاک و ہند کی پوری اسلامی تحریک فی الحقیقت اسی کی مرہون منت ہے اور خود اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ۔

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

بیسویں صدی عیسوی میں برعظیم ہند و پاک میں احیاء اسلام کا جو غلغلہ بلند ہوا وہ سب اسی مرد درویش کا فیض ہے جسے ہم اوپر حضرت مجددؒ کا ظل قرار دے چکے ہیں۔

تجدید و احیائے دین کے عملی میدان میں اگرچہ آغاز میں سرسید مرحوم کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے متعدد اہم اشخاص "حکومت الٰہیہ" کے زور دار نعرے کے ساتھ اترے لیکن کچھ حالات کی ناموافقت اور کچھ اپنی استقامت کی کمی کے باعث سب کے سب ناکام ہوگئے۔ چنانچہ ان میں سے بعض تو فوراً ہی منظر سے غائب ہوگئے' جیسے خیری برادران' اور بعض نے اپنے جوش اور جذبے اور تنظیمی و عسکری صلاحیت کی بنا پر کچھ عرصے کے لئے بڑا سماں باندھا' جیسے علامہ مشرقی' لیکن وہ واحد شخصیت جس سے ایک ایسی نئی روایت کا آغاز ہوا جس کا تسلسل خود اس کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد بھی قائم رہا مولانا ابوالکلام آزاد کی تھی' اور اگرچہ یہ نہ خود انہوں نے کبھی تسلیم کیا' نہ ان کا کوئی عقیدت مند آج تسلیم کرے گا کہ انہوں نے کوئی اثر علامہ اقبال سے قبول کیا تھا' لیکن اگر ذرا شخصی محبت و عقیدت کے پردے ہٹا کر حقیقت پسندانہ نگاہ سے دیکھا جائے' اور زمان و مکان کے ناقابل تردید حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ ۱۹۰۸ء میں جب اقبال کی ملی شاعری کا ڈنکا بجنا شروع ہوا احمد المکنی بہ ابی الکلام کی عمر کل بیس برس تھی۔ گویا یہ اس ذہین اور طباع نوجوان کی زندگی کا سب سے زیادہ حساس اور اخاذ دور تھا' تو کیسے ممکن ہے کہ اس کے ذہن و فکر کی تشکیل میں اس " بانگ درا" اور " بانگ رحیل" کا کوئی حصہ نہ ہو جو اقبال کی ملی شاعری کی صورت میں برعظیم کے پورے طول و عرض میں گونج رہی تھی' خصوصاً جبکہ اس کی ابتدائی تربیت میں موثر حد تک عمل دخل آسمان سرسید ایک ٹوٹے ہوئے تارے علامہ شبلی کو بھی حاصل تھا!

بہرحال اس وقت نہ اس پر زیادہ بحث کا موقع ہے کہ مولانا آزاد کے قلب و ذہن میں احیاء اسلام کا جذبہ و ارادہ علامہ اقبال کی ملی شاعری کے زیر اثر پیدا ہوا تھا یا یہ براہ راست ع "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں!" کی صورت تھی۔ اس وقت جس حقیقت کی جانب توجہ دلانی مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ابوالکلام کی شخصیت اور کارنامے کو اگر دو حصوں میں تقسیم کرلیا جائے تو ان میں سے ایک یعنی امت مسلمہ کی زبوں حالی' اور اولاً جنگ بلقان اور پھر پہلی عالمگیر جنگ کے دوران مسلمانوں پر دول یورپ کے مظالم پر مرثیہ خوانی' اور عظمت قرآن کے بیان اور اس کی جانب موثر اور زور دار دعوت کو علامہ اقبال اور مولانا آزاد کے مابین قدر مشترک کی حیثیت حاصل ہے۔ ان میں سے بھی ظاہر ہے کہ احیاء اسلام کے نقطہ نگاہ سے زیادہ اہمیت دوسری بات کی ہے' اور اس کے ضمن میں ان دونوں کے مابین صرف اسلوب اور انداز کا فرق ہے یعنی جہاں اقبال نے قرآن کو اپنے اشعار میں " سمو" دیا' وہاں آزاد نے اسے اپنی نثر کی روح رواں بنا دیا۔ اور اسی سے آزاد کی نثر کو یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ حسرت موہانی ایسا شخص پکار اٹھا کہ۔

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا!

اسی طرح جہاں اقبال کے یہاں " فکر" کا پلڑا بھاری ہے وہاں آزاد کے یہاں " دعوت" کا انداز غالب ہے----

البتہ مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کے متذکرہ بالا آٹھ سالہ دور کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ "منفرد" ہیں۔ یعنی اقبال نے اللہ کی حاکمیت اور "نور توحید کے کے اتمام" کا جو نعرہ لگایا اور ملت بیضا کی از سرنو "شیرازہ بندی" اور ع "یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے!" کی جو نوید جانفزا سنائی' اس کے لئے عملی جدوجہد کے ضمن میں " راست اقدام" کے ناگزیر تقاضوں کی تعمیل اور تکمیل کی جانب توجہ دلانے کے ساتھ ساتھ پہلا عملی قدم ابوالکلام نے اٹھایا۔

اس سلسلے میں انہوں نے جہاں فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اہمیت' حکومت الٰہیہ اور خلافت اسلامیہ کے قیام کی فرضیت' اور اس کے لئے جہاد فی سبیل اللہ کے لزوم کو اپنی تحریر اور تقریر کے اہم موضوعات کی حیثیت دی وہاں دو عظیم حقیقتوں کی جانب مسلمانوں کی توجہ مبذول کرانا تو ان کا پوری امت مسلمہ پر بالعموم اور حال اور مستقبل کی تمام احیائی تحریکوں پر بالخصوص عظیم احسان ہے۔ یعنی (۱) ایک یہ کہ یہ کام ایک منظم اور سمع و طاعت کی خوگر جماعت کے قیام کے بغیر ناممکن ہیں اور (۲) دوسرے یہ کہ مستقبل کا "اسلامی انقلاب" بھی صرف اسی طریقہ کار پر عمل پیرا ہو کر برپا کیا جاسکتا ہے جس کے ذریعے چودہ سو سال قبل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انقلاب جزیرہ نمائے عرب میں برپا کیا تھا!

ان میں سے پہلی بات کے لئے تو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ کی ایک حدیث مبارک کا حوالہ دیا جو مشکوٰۃ شریف میں مسند احمدؒ اور جامع ترمذیؒ کے حوالے اور حضرت حارث اشعریؓ کی روایت سے موجود ہے' یعنی: آپؐ نے فرمایا: "مسلمانو! میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ (ایک روایت میں یہ اضافی الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں: "مجھے ان کا حکم اللہ نے دیا ہے") یعنی جماعت کا حکم' سننے کا حکم' اطاعت کا حکم' ہجرت کا حکم' اور جہاد فی سبیل اللہ کا حکم!" ان پانچ باتوں کا تعلق اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے ساتھ تو اظہر من الشمس ہے۔ یعنی اگر اسلامی حکومت یا نظام خلافت قائم ہو تو ان پانچوں احکام پر عمل لازمی طور پر خود بخود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک عالم اسلام میں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں (خواہ ملوکیت ہی کی صورت میں) قائم رہیں ان پانچ احکام کا حوالہ بھی کسی نہ کسی درجہ اور حیثیت میں برقرار رہا۔ لیکن جب مسلمان ممالک پر

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

"افسوس جب میں اپنا دایاں ہاتھ دائیں جیب میں ڈالتا ہوں تو کھوٹے سکے نکلتے ہیں' بایاں ہاتھ بائیں جیب میں ڈالتا ہوں تو کھوٹے سکے نکلتے ہیں"

قائداعظم نے یہ کب کہا' کہاں کہا؟

قائداعظم کا ایک فدائی برسہا برس سے ان الفاظ کی منادی کررہا ہے

سعید حمید الدین

بنوں میں سعید حمید الدین صاحب تحریک خلافت پاکستان کے ایک پرجوش معاون ہیں۔ اپنے شہر میں وہ "دی وائس آف بنوں" کے آرگنائزر اور "کنزیومرز ویلفیئر سوسائٹی" کے جنرل سیکرٹری کے طور پر بھی جانے پہچانے جاتے ہیں۔ قومی مسائل پر سوچنا اور ساتھ ساتھ مقامی معاملات کو بھی نظرانداز نہ کرنا ان کی عادت سی ہے۔ ان کی تحریر کو بہت معمولی قطع و برید کے بعد پیش کیا جارہا ہے تاکہ ان کے جذبات کی ترجمانی کا حق ادا ہوسکے۔۔۔۔ مدیر

ریڈیو' ٹی وی اور اخبارات میں قائداعظم کے چیدہ چیدہ اقوال ان کی تقریر کے مقام اور تاریخ کے حوالوں کے ساتھ بلاناغہ پڑھنے سننے کو ملتے ہیں۔ مثلاً مدراس کے جلسہ عام میں یہ بات کہی تھی' کلکتہ' لکھنؤ' علی گڑھ' دہلی' لاہور' پشاور وغیرہ میں یہ کہا لیکن بنوں کی تقریر حرف غلط کی طرح نیست و نابود کردی گئی ہے۔ قائداعظم کی ۱۶ر اپریل ۴۸ء کی بنوں کی تقریر پر کھوٹے سکوں یعنی خود غرض' مفاد پرست بددیانت نام نہاد مسلم لیگیوں اور بیوروکریسی کے نمک حراموں نے پہلے ہی دن سے ایسے کڑے پہرے بٹھادئے کہ عام شہریوں کو کجا' معروف ادیبوں صحافیوں کالم نگاروں کو بھی علم نہیں کہ "کھوٹے سکوں" کے لافانی الفاظ بانی پاکستان بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے کب اور کہاں ارشاد فرمائے تھے۔

اخبارات اور جرائد میں "کھوٹے سکوں" کے مشہور الفاظ کبھی کبھار اگر پڑھنے کو ملتے بھی ہیں تو اس شکل میں گویا مضمون نگار نے یہ دو الفاظ انجانے خوف سے کپکپاتے ہوئے کھڑکیوں' دروازوں اور روشندانوں کو بند کر کے ڈر ڈر کر رک رک کر سرگوشی کے انداز میں لکھ ڈالے ہوں۔ ان دو الفاظ کے آگے پیچھے کسی تفصیل' کسی کڑی' کسی مقام کسی تاریخ کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ گویا بند بوتل کا ڈھکنا لرزتے لرزتے کھولا جس سے کھوٹے سکوں کی درد بھری چیخ جونہی نکلی' جھٹ بوتل کا ڈھکنا بند کر ڈالا۔ خوف اور دہشت کی یہ ارزانی فراوانی ڈنکے کی چوٹ اعلان کرتی دہائی دیتی نظر آتی ہے کہ ہمارے یہاں جھوٹ اور منافقت کی حکمرانی ہے۔ خدا لگتی سچ سیدھی حق بات زبان پر' قلم پر آہی نہیں سکتی' آئینگی تو کروڑوں تازیانوں جلادوں زندانوں عقوبت خانوں' بھیڑیوں' چیتوں' درندوں کے راستوں سے کٹ مر کر لہولہان ہو کر آئیگی۔ جمہوریت اسلام یعنی' توکل برخدا' دلیری' بیخوفی' بے باکی کا پاکستان کو سب سے مہیب قبرستان بنادیا گیا ہے' اسی لئے یہاں خدا پرستی کو چھوڑ کر قبرپرستی اپنائی جارہی ہے۔

جس ملک میں ۹۹ فی صد ہولناک جرائم وزیر اور مشیر کریں' ممبران صوبائی و قومی اسمبلی کریں' پولیس اور افسر شاہی والے فرعون کریں اور کھلے بندوں کریں مگر پکڑے نہ جائیں۔ پکڑا جائے تو چپڑاسی' کلرک' پولیس کنسٹیبل یا پٹواری!

جنرل ضیاء الحق صاحب بھی کہا کرتے تھے کہ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ بہت سی سابقہ قومیں اس لئے خدا کے غیظ و غضب کا شکار ہوئیں کہ قانون کی گرفت میں غریب کو لایا جاتا تھا' امیر کو نہیں۔ جس ملک کے وزیروں سیاست دانوں کا بیہودہ جلسے منعقد کرنے راہ گم کردہ عوام کو سڑکوں پر لانے اور سوفی صد لغو جھوٹی منافقانہ تقریروں کے سوا اور کوئی کام نہ ہو اور حکمرانوں کے جلسوں کی تشہیر اخبارات میں ایک ایک مربع فٹ کے اشتہارات سے کرائی جائے۔ دیوی دیوتا کی آمد پر پرستاروں کا میلوں جلوس جس میں پھولوں کی پتیوں کے نچھاور کرنے' بھنگڑے' ڈانس' نعرہ بازیوں' چیخم دھاڑ کا ایسا اہتمام ہو گویا دیوی دیوتا اسلام آباد سے سکھر لاڑکانہ یا سندھڑی نہیں آئی یا آیا بلکہ سیاچین گلیشیئر میں بہادری کا لوہا منوا کر یا چاند پر جھنڈا گاڑ کر آئی ہے یا آیا ہے' تو ایسے ملک میں خوشامد' چاپلوسی' مفاد پرستی' شخصیت پرستی' بے حیائی' کینگی' اور بے غیرتی پروان چڑھے گی یا اصول پرستی حق پرستی خدا پرستی! یہ

المناک شرمناک صورت حال ہمیں نظریہ اسلام نظریہ پاکستان اخلاق شرافت انسانیت سے سنگین روگردانی اور بغاوت کا مجرم قرار دے رہی ہے۔ جس ملک کے بانی معمار کی درد بھری نصیحت کو سنتے ہی تہ تیغ کردیا جائے 'اس ملک کے عام شہری کی سچ بات کس طرح اور کیونکر بلند و بالا آہنی دیواروں قلعہ بندیوں قانکوں گن مینوں کو پار کر کے اپنا راستہ بنائیگی!۔

خالق کائنات پر ایمان ملک اور قوم شرافت انسانیت کے ساتھ محبت عقیدت کا یہ تقاضہ ہے کہ سچ کو پھیلانے جھوٹ کو رسوا کرنے ظلم وستم کا مردانہ وار مقابلے کا کام عزم بالجزم سے شروع کیا جائے۔ بقول حضرت علی کرم اللہ وجہہ الملک یبقی مع الکفر ولا یبقی مع الظلم کوئی ملک اللہ کے وجود سے انکار کے ساتھ تو قائم رہ سکتا ہے لیکن ظلم کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتا۔ تمام باضمیر حق پرست محب وطن اخبارات و جرائد ادیبوں 'صحافیوں 'حریت پسندوں ' روشن خیالوں حقوق انسانی کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ وہ منافق بدعنوان پیشہ ور سیاست دانوں اور چور حرام خور بیورو کریسی کے ہاتھوں بابائے قوم کی اغوا کردہ درد بھری تقریر کو ۲۵ر دسمبر کو ان کے یوم ولادت پر خصوصی طور سے ملک کے کونے کونے میں پہنچائیں۔

قائداعظم ۱۶ر اپریل ۱۹۴۸ء کو پہلی اور آخری بار بنوں آئے تھے۔ بنوں کے عوام نے قائد کا ذکر تو بہت سنا تھا انہیں دیکھا نہ تھا۔ واضح رہے کہ قیام پاکستان سے پہلے بنوں ' خدائی خدمتگار تحریک اور کانگریس پارٹی کا صوبے بھر میں سب سے بڑا قلعہ تھا۔ بنوں میں ہندوؤں کی تعداد کا تناسب باقی اضلاع کے مقابلے میں زیادہ تھا۔ گاندھی جی اور پنڈت نہرو نے صوبہ سرحد میں سب سے زیادہ دورے بنوں کے کئے تھے۔ اسی اثر و نفوذ کی بدولت پختونستان کا ریزولیوشن ۲۲ر جون ۱۹۴۸ء کو بنوں میں پاس کرایا گیا تھا ' چار سدہ مردان یا پشاور میں نہیں چنانچہ ۱۶ر اپریل ۴۸ء کو اتنی عدیم النظیر تعداد میں دور دراز علاقوں کے لوگ قائداعظم کو دیکھنے سننے کے لئے جلسہ گاہ آئے تھے کہ پہلے نہ تو گاندھی جی نہ پنڈت نہرو کے جلسوں میں دیکھے گئے۔ قائداعظم کو اپنی تقریر بنوں قلعہ کی چھت سے اس مقام پر کھڑے ہو کر کرنی پڑی جو موجودہ کینٹ مارکیٹ کے عین سامنے ہے جہاں قلعے کی فصیل قوس بناتی ہے۔ علامہ اقبال نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا پاکستان نہیں دیکھا تھا۔ جبکہ قائداعظم نے قرار داد پاکستان پاس ہونے کے سات سال بعد پاکستان بنا دیا اور ۱۶ر اپریل ۱۹۴۸ء کو دو بجے بعد دو پہر جب وہ قلعے کی چھت سے تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو پاکستان کو بنے آٹھ ماہ دو دن ہو چکے تھے۔

قائداعظم نے کہا میرے ہم وطنو! پاکستان بن گیا ہے۔ ہم نے کام چلانیکی خاطر بہت کم عمر نا تجربہ کار افراد کو نہایت اہم عہدے ذمہ داریاں سونپ دی ہیں۔ اب اگر آپ کے مسائل ٹھیک طرح حل نہ ہوتے ہوں تو آپ پاکستان کو برا بھلا مت کہیں بلکہ اپنی شکایت متعلقہ افسر کو پیش کریں۔ اگر وہ نہ سنے تو اس کے اعلیٰ افسر کو اپنی شکایت پہنچائیں۔ اگر وہ بھی نہ سنے تو محکمے کے ڈائریکٹر 'سیکرٹری وزیر حتیٰ کہ وزیراعلیٰ کو اپنی شکایت پہنچانے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اگر وزیراعلیٰ بھی فریاد نہ سنے تو وزیراعظم کو اپنی شکایت بذریعہ رجسٹر ڈاک بھیجیں۔ دوسری اہم بات اپنی تقریر میں یہ کہی تھی کہ پاکستان ایک فلاحی ملک بنانے کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ہے۔ ملک میں جو عناصر رشوت سفارش دھونس دھاندلی صوبہ پرستی اقربا پرستی پھیلا رہے ہیں ان کو سختی سے دبانا ہوگا۔ تیسری اہم بات انہوں نے یہ کہی تھی کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے لیکن افسوس جب میں اپنا دایاں ہاتھ دائیں جیب میں ڈالتا ہوں تو کھوٹے سکے نکلتے ہیں۔ بایاں ہاتھ بائیں جیب میں ڈالتا ہوں تو کھوٹے سکے نکلتے ہیں۔

قائداعظم نے صرف پانچ منٹ تقریر کی تھی۔ وہ بہت کمزور اور نڈھال دکھائی دے رہے تھے۔ تقریر کے الفاظ کانوں کو ایسے لگ رہے تھے گویا انہیں دل کی آخری گہرائیوں سے جڑوں سے اکھیڑ اکھیڑ کر کھینچ کھینچ کر قائداعظم اپنی زبان پر لا رہے ہوں۔ آواز غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی اور پہلے جیسے دم خم ' مجمع پر سکوت طاری کرنے والی گھن گرج سے بالکل عاری تھی۔ چنانچہ جلسہ گاہ میں بے حد شور و غل تھا۔ ان کی باتیں وہی اچھی طرح سے سن پائے جو سٹیج کے قریب کھڑے تھے۔ قائداعظم کے پیچھے صوبہ سرحد کے آخری انگریز گورنر ڈنڈاس ' وزیراعلیٰ خان عبدالقیوم خان اور بریگیڈیئر (بعد میں فیلڈ مارشل) محمد ایوب خان کھڑے تھے۔

راقم الحروف ۸۷ء سے بابائے قوم کی اس یادگار تقریر کو زندہ واجاگر کرنے میں لگا ہے۔ نتیجہ یہ بر آمد ہوا ہے کہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کو ۲۷ر اپریل ۹۱ء کے دورۂ بنوں سے قبل تاریخ میں پہلی بار Quaids Memorial (قائدز میموریل) کا ہورڈنگ بنوں کینٹ میں نمودار ہوا۔ بنوں قلعے کی فصیل کی جس جگہ سے یہ تقریر ہوئی تھی اس کی صفائی ' لپائی ' کی گئی وہاں جلی حروف میں Unity ' Faith and Discipline کے الفاظ کندہ کئے گئے۔ پاس ہی دائیں بائیں Quaids Monument کے دو ہورڈنگ لگے دکھائی دینے لگے۔ اس طرح ۴۳ سالوں بعد یہ صداقت بری افواج کی جانب سے تسلیم کی گئی کہ قائداعظم نے ملک کے کسی اور قلعے سے کوئی تقریر نہیں کی۔ یہ منفرد اعزاز بنوں کے قلعے کو حاصل ہے۔ مزید یہ صداقت منظر عام پر آئی کہ بانی پاکستان نے ۱۶ر اپریل ۴۸ء کو بنوں میں قوم کو خطاب کیا تھا جس سے منافق ' بدعنوان ' پیشہ ور سیاستدانوں اور سول اور فوجی بیورو کریسی کی بابائے قوم کی بنوں کی تقریر کو زمین دوز کردینے کی ۴۳ سالہ ریشہ دوانیوں کا سلسلہ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس پیش رفت کا کریڈٹ موجودہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف کو جاتا ہے۔ تاہم قائداعظم کی درد بھری نصیحت بدستور لاکھوں ٹنوں برف کے نیچے دبی ہے ڈھکی چھپی ہے۔

جس قوم کے خود غرض خود ساختہ نام نہاد لیڈر اپنے باپ کی نصیحت کو زمین میں گاڑتے ہیں ' وہ پوری قوم کو زندہ درگور کرتے ہیں ' ذلیل و رسوا کرتے ہیں۔ بددیانت ' پیشہ ور سیاستدانوں یعنی کھوٹے سکوں نے ہرے بھرے ملک کو ویران ' قبرستان اور مسائلستان بنا ڈالا ہے۔ عیسائی ' یہودی اور دیگر مذاہب کے لوگ ہزاروں سال پہلے فضا میں تیرتی ہوئی آوازوں کا سراغ لگا رہے ہیں اور سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہیں لیکن پاکستان میں مکاری حرام کاری ' ریاکاری کا بازار گرم ہے۔ ان شرمناک طور طریقوں کے ساتھ ہم اکیسویں صدی کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں یا فرعونوں ' نمرودوں کے دور کی طرف لڑھک رہے ہیں؟ وقت آگیا ہے کہ قائداعظم کی بنوں کی تقریر کو ریڈیو ' ٹی وی اخبارات ' جرائد پر لایا جائے اور ملک کے کونے کونے میں پھیلایا جائے۔ ورنہ پاکستان دن بدن کھوٹا پاکستان بنتا چلا جائے گا۔ معمار و بابائے پاکستان کی اغوا کردہ تقریر کو رہائی دلانے سے بابائے قوم کی تلملاتی روح کو چین نصیب ہوگا اور خرمست حکمرانوں ' بدمست سرکاری اہلکاروں کو آدمیوں کے بچے بنانے میں بڑی مدد ملے گی۔ کھوٹے سکوں کی جگہ کھرے سکے کیا ہمیں عزیز نہیں۔○○

جسٹس جاوید اقبال کا نفسیاتی مسئلہ

صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی

انہیں اقبال سے اپنی نسبت شاید پسند نہیں!

کیا "ویمن ایکشن فورم" اسلام کے بارے میں اظہار خیال کا صحیح فورم ہے؟

مہذب معاشرے میں اظہار رائے کا مہذب طریقہ اس فورم سے بات کرنا ہے جو اس مقصد اور موضوع کے لئے طے کیا گیا ہو۔ پریس کے معاملات پریس کے فورم سے اور پارلیمینٹ کے مسائل پارلیمینٹ کے فورم پر زیر بحث آنے چاہیں - پارلیمانی امور اگر تھانے میں اور صحافتی قواعد بازاروں اور چوکوں میں موضوع بحث بننے لگیں تو اہل فکر و نظر کو خوف محسوس کرنا چاہیے کہ بات بننے کی بجائے بگڑنے پر آگئی ہے۔ "جس کا کام اسی کو ساجھے" کا محاورہ بھی غالباً" اسی حزم و احتیاط کے سبب وضع کیا گیا ورنہ ہر بوالہوس کے حسن پرستی شعار کرنے کا فیشن بن جائیگا اور ہوس و حسن کی حدود پامال ہو کر رہ جائیں گی مگر بدقسمتی سے "اسلام" کچھ ایسا مظلوم موضوع ہے کہ جو چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے 'اپنی سقراطی بقراطی بھگارنے میں جت جاتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ دنیا کے ہر موضوع پر گفتگو کرنے سے تو زیادہ سے زیادہ غلط اور صحیح کا احتمال پیدا ہوتا ہے لیکن اسلام اور اس کے بنیادی تصورات و عقائد پر بحث کفر و ایمان تک پہنچ جاتی ہے اور کمزور سے کمزور مسلمان کو بھی بہرحال اپنے ایمان کا دھیان رہتا ہے' ہماری سوسائٹی لگتا ہے کسی اندھے شوق میں مبتلا ہوگئی ہے کہ وہ ہر چیز کو ادھیڑنے' کھدیڑنے' لتاڑنے' بگاڑنے اور چیرنے پھاڑنے میں مصروف ہے۔

کوئی مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہو تو اس پر رائے زنی' تنقید یا گرفت توہین عدالت قرار پاتی ہے جبکہ یہ توہین عدالت کا تصور الہٰی نہیں محض انسانی ہے مگر ہم اس کا اس لئے بھی اہتمام کرتے ہیں کہ ہمیں سزا ہو سکتی ہے اور اس لئے بھی اسے ملحوظ رکھتے ہیں کہ اگر ہر شخص ہر معاملے میں اپنے لئے آزادی اظہار کا حق محفوظ کر لے تو اس کا حق تو محفوظ ہو جائیگا لیکن باقی سب اداروں اور افراد کے حقوق کا تیاپانچہ ہو کر رہ جائیگا اور اگر ایسا ہونے لگے تو پھر ایسی سوسائٹی "جنگل لاء" کا نمونہ پیش کرے گی۔ تہذیب و تمدن' قانون کی بالادستی' روایات کی پاسداری' تحمل و برداشت' شرف انسانی' احترام آئین' اور اداروں کا وقار سب ہوا میں ریت کے ذروں کی طرح بکھر جائیگا۔

یہ بات کہنے کی تقریب یوں پیدا ہوئی کہ ایک عرصے سے جسٹس جاوید اقبال اسلام کے بارے میں اپنے ایسے ذاتی تصورات اور خیالات پیش کر رہے ہیں جن کا زیادہ تر تعلق ان کے ذہنی تحفظات سے ہوتا ہے' اسلام کی اساسیات سے قطعاً" نہیں۔ جسٹس جاوید اقبال ہمارے لئے سہ گونہ احترام کے قابل ہیں' ایک تو وہ فرزند اقبالؒ ہیں.... وہی اقبال جسے ہم پاکستان نژاد لوگ اپنے پیارے ملک کا مصور سمجھتے ہیں..... وہی اقبالؒ جسے ارباب دانش و حکمت نے "حکیم الامت" کا خطاب دیا ہے... وہی اقبالؒ جو بجا طور پر "فیلسوف مشرق" ہیں اور یہ اعزاز ہم اہل مشرق کے لئے کچھ کم نہیں... وہی اقبالؒ جس نے "تو بہ زمانہ ساز" کی بجائے "تو بہ زمانہ ستیز" کا درس حریت دیا اور لے دے کر یہی فکری اثاثہ ہمارے پاس رہ گیا ہے۔

جس پر ہمارے دوبارہ جی اٹھنے کا تھوڑا بہت انحصار رہ گیا ہے... وہی اقبالؒ جس نے۔

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

جیسا لازوال اور لافانی شعر کہہ کر ہمارا قبلہ توجہات متعین کردیا اور ہمیں اپنی تہذیب کے حوالے سے سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ بخشا.... وہی اقبالؒ جس نے نطشے کی نامرادی پر تبصرہ کرکے اہل مشرق کی ذہنی غلامی کا داغ دھو دیا ☐

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

احترام کی دوسری نسبت ان کا عدالت عظمیٰ کا جج ہونا ہے اگرچہ اب وہ ریٹائر ہو چکے ہیں' تیسری وجہ ان کا صاحب علم و فضل ہونا ہے جس سے کم از کم مجھ ایسے طفل مکتب کو کبھی انکار نہیں رہا اور انکار ہونا بھی نہیں چاہیے - اب ایک شخص فرزند اقبال ہو' ریٹائرڈ جسٹس ہو اور صاحب علم ہو تو اس سے اختلاف نرم سے نرم الفاظ میں شوخی ہی سمجھی جائیگی اور بالخصوص وہ آدمی اختلافی نقطہ نظر پیش کر رہا ہو جسے پیانہ علم کی تلچھٹ بھی میسر نہ ہو اور جسے اپنی تہذیب' اپنے لباس' اپنی زبان' اپنے آداب تمدن اور اپنے عقیدے پر فخر کرنے کا سبق علامہ اقبال کی نثر اور نظم نے دیا ہو اور وہ اس کے فرزند عزیز کے منہ آئے! بایں ہمہ مجھ ایسے نادان اور گستاخ کا فرزند اقبال سے یہ گلہ ضرور بنتا ہے کہ وہ اپنے اظہار خیال میں ان تینوں نسبتوں کو نجانے کس احساس کے تحت نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اقبالؒ معناً" ہی نہیں لفظاً بھی اسلام کے پیرو اور پر جوش داعی رہے اور دور فتن میں تو تقلید کو محفوظ راستہ قرار دیتے رہے کوئی وقتی مصلحت' جوش' دباؤ اور منفعت انہیں اس روش سے نہ ہٹا سکی' اور خلافت جیسے از کار رفتہ ادارے کی تحلیل پر بول اٹھے۔ ع

چاک کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا!

جبکہ فرزند اقبال یہ جسارت کرنے سے نہیں چوکتے

کہ "شریعت ایک فرسودہ چیز بن کر رہ گئی ہے" (نوائے وقت ۱۹ر اکتوبر ۹۲ء)

ڈاکٹر جاوید اقبال عدالت عظمیٰ کے جج رہے۔ قبل ازیں عدالت عالیہ لاہور کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں انہیں بخوبی معلوم ہونا چاہیے کہ اظہار خیال کے آداب کیا ہیں۔ اگر ان کے دور قضا میں کوئی ان کے زیر سماعت کسی مقدمے کو پریس یا موچی دروازہ میں لے آتا تو جسٹس جاوید اقبال کے احساسات کیا ہوتے؟۔ اب خود ہی فرمائیں کہ "ومن ایکشن فورم" کیا اسلام کے بارے میں اظہار خیال کا صحیح فورم ہے؟۔ اور "ومن جو اس کی روح رواں ہیں' وہ سب کی دیکھی بھالی ہیں اور ان کی سنجیدگی' ثقاہت اسلام سے عملی تعلق اور نظریاتی پختگی ہر ایک پر عیاں ہے' لیکن وہ بات اتنی تفصیل اور سنجیدگی سے کرتے ہیں گویا دنیا بھر کے اسلامی مفکرین سکالرز' صاحبان تحقیق و تصنیف اور سنجیدہ مدبرین ان کے سامع ہیں اور آج کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو کر رہے گا حالانکہ ہم ایسے تہی دامانوں کو بھی معلوم ہے کہ ایسے ہوٹلوں میں ایسی تقاریب معاشرتی تعلقات بڑھانے' چائے کی پیالی پر گپ شپ کرنے' دل کا غبار نکالنے' شیخی بگھارنے اور جان کی امان پاؤں تو تصویر کھینچنے اور نمبر بنانے کے لئے منعقد ہوتی ہیں۔ جو لوگ سنجیدہ کام کے عادی ہوتے ہیں وہ فائیو سٹار ہوٹلوں اور فوٹو گرافرز کے جلو میں نہیں کسی لائبریری کے کونے میں سر بجیب بیٹھے نظر آتے ہیں جو اپنی شاندار تحقیق کو بھی حرف آخر نہیں کہتے اور عمر بھر طالب علم بن کر رہتے ہیں مگر ایسے ایکشن فورم اگر ایک وقت میں اسلام' شریعت' آئین' پارلیمنٹ پر مصروف بحث ہوتے ہیں تو دوسرے وقت مال روڈ پر مصروف مظاہرہ نظر آتے ہیں اور اس سے ان کے مزاج کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

تیسری گذارش یہ ہے کہ جسٹس جاوید اقبال کے علم و فضل میں کس کو دن کو شک ہے لیکن یہ انہی کے والد گرامی کا فلسفہ ہے کہ محض علم سے شہرت طاقت اور دولت تو مل جاتی ہے لیکن ع

ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ

علم میں اپنا سراغ اس وقت نہیں ملتا جب علم کسی نصب العین' کسی مقصد' کسی منزل' کسی نتیجے' کسی آئیڈیل اور کسی کمٹمنٹ کے بغیر فقط ذہنی عیاشی' موضوع بحث' وقت گزاری ذخیرہ معلومات' الفاظ و حروف کی بازیگری اور نری ایج بن کر رہ جائے اور آج کل کے بیشتر "ڈگری ہولڈرز" کا یہی المیہ ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال عدالت عظمیٰ کے جج رہے' قبل ازیں عدالت عالیہ لاہور کے چیف جسٹس رہ چکے ہیں۔ انہیں بخوبی معلوم ہونا چاہیے کہ اظہار خیال کے آداب کیا ہیں۔ اگر ان کے دور قضا میں کوئی ان کے زیر سماعت کسی مقدمے کو پریس یا موچی دروازہ میں لے آتا تو جسٹس جاوید اقبال کے احساسات کیا ہوتے؟۔ اب خود ہی فرمائیں کہ "ومن ایکشن فورم" کیا اسلام کے بارے میں اظہار خیال کا صحیح فورم ہے؟۔ جبکہ "ومن" جو اس کی روح رواں ہیں' وہ سب کی دیکھی بھالی ہیں اور ان کی سنجیدگی' ثقاہت' اسلام سے عملی تعلق اور نظریاتی پختگی ہر ایک پر عیاں ہے۔ لیکن وہ بات اتنی تفصیل اور سنجیدگی سے کرتے ہیں گویا دنیا بھر کے اسلامی مفکرین' سکالرز' صاحبان تحقیق و تصنیف اور سنجیدہ مدبرین ان کے سامع ہیں اور آج کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو کر رہے گا۔

بالکل سادہ لفظوں میں عرض کر دوں تو نقشہ کچھ یوں بنتا ہے کہ نماز کے قریب نہیں آنا مگر اس کے اسرار و رموز' حکمت و فلسفہ' مقاصد و اغراض اور تہہ در تہہ معانی پر ایک پورا لیکچر تیار ہوتا ہے اور چند منٹ کے نوٹس پر "لیکچرز" کو عطا کر دیا جاتا ہے۔ احکام شرعی کی پابندی بالکل ندارد مگر اس کی اصلاح و کنزیوشن' اس کے سماجی پس منظر' اس کے اطلاقات اور عصر جدید سے ہم آہنگ کرنے کی فلاسفی بیان کہنے پر ہر وقت آمادہ و مستعد۔ یہ ہی وہ ٹریجڈی ہے جس نے دل اور دماغ' قول اور فعل' فکر اور نظر' فرد اور اجتماع سب میں بعد اور فرق پیدا کر دیا ہے اور پورا معاشرہ بھانک پھانک ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر اسے بدگمانی اور زود رنجی پر محمول نہ کیا جائے تو اس طرح کے بحث مباحثوں کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک کے متجددین دراصل اسلام کو ایک حرکت' عمل' انقلاب' اصلاح' ذریعہ فلاح بنانے کی بجائے فقط علمی بحث کا موضوع اور ہلکی پھلکی تقریر کا عنوان سمجھتے ہیں۔ وہ اسلام کی رخصتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے مگر اس کی پابندیوں سے رسے تڑاتے ہیں۔ ان کا من پسند مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بیان کریں کہ اسلام نے قانون کے احترام کا عظیم الشان پیغام دیا ہے۔ وہی قانون اگر ان پر نافذ ہونے لگے تو کہتے ہیں دور حاضر میں نہیں چل سکتا۔ اسے عصر جدید سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ المختصر یہ وہ ذہنی لذت ہے جس کا آج کل کا روشن خیال دانشور عادی ہو چکا ہے۔ اگر کوئی اسے اس روش پر ٹوکے یا دستبردار ہونے کا مطالبہ کرے تو وہ بے چارہ فوراً بنیاد پرست" ملا" تاریک خیال اور "قرون وسطیٰ کا آدمی" بن جاتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے لیکچر میں فرمایا ہے کہ ملا حاکمیت الٰہی کا تصور دے کر پارلیمنٹ کی بالادستی ختم کرنا چاہتے ہیں "اس ضمن میں پہلی بات تو یہ ہے کہ کون سی پارلیمنٹ؟۔ وہی نا جس میں ہر رسہ گیر' وڈیرا' جاہل' سمگلر' اور بندہ ہوا و ہوس تو پہنچ جاتا ہے مگر جسٹس جاوید اقبال عمر بھر کوشش کر دیکھیں وہ اس کے لئے منتخب نہیں ہو سکتے کیونکہ پارلیمنٹ میں ہر ایک کی ضرورت ہوتی ہے لیکن عالم فاضل اور تعلیم یافتہ آدمی کی قطعاً ضرورت نہیں پڑتی۔ ہاں البتہ رسہ گیروں کے گروہ کی اعانت سے ایسا ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب رکن بن جائیں۔

اور کیسی پارلیمنٹ؟ جس میں گالم گلوچ' گریبان پھاڑنے' مائیک اٹھا کر مارنے اور کرسیاں چلانے کا چلن عام ہے۔ کیا ایسی پارلیمنٹ کی بالادستی مطلوب ہے جس کا نمایاں شعار "ہارس ٹریڈنگ"

ہے؟۔

ملا بیچارہ اپنی بالادستی نہیں چاہتا' حاکیت الٰہی کی بالادستی چاہتا ہے کہ ہر کوئی محکوم ہو اور حاکم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو' قرآن و سنت ہو اور اسلامی شریعت ہو مگر ڈاکٹر صاحب جیسے لوگ ہر ایک پر بشمول ملا اپنی حاکیت بذریعہ پارلیمنٹ قائم کرنا چاہتے ہیں اور پھر ان پر کوئی حاکم نہ ہو' وہ جو چاہیں کرتے پھریں' پورا ایوان بیچ کھائیں' خزانہ لوٹ لے جائیں' صدر اور وزیراعظم تک کی کرسیاں نیلام ہوجائیں' انہیں کہیں چیلنج نہ کیا جائے' ان پر کوئی قدغن نہ ہو۔ میرے خیال میں ملا کا یہی مطالبہ ہے نہ بیش نہ کم! اگر ملا اپنی بالادستی چاہتا ہے تو میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ مل کر اس نیت اور ارادے کی مذمت کرتا ہوں لیکن کسی سنجیدہ استدلال کے ساتھ "ملا" کی اس نیت کے فتور کو ثابت تو کیا جائے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے یہ بھی فرمایا ہے کہ " اسلام صرف عورت کے سر پر دوپٹہ رکھنے اور شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اضافے تک محدود ہوگیا ہے۔" یہ بات کم از کم فرزند اقبال کے منہ سے زیب نہیں دیتی جس کے عظیم باپ نے " تشکیل جدید فلسفہ الٰہیات اسلامیہ" کے موضوع پر حد درجہ پر مغز خطبات دئے ہوں اور جو مولانا انور شاہ کشمیریؒ کو فقہ اسلامی کی تدوین نو کے لئے لاہور بلانے کی دعوت دیتا رہا ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے قبیل کے لوگ آخر عورت کے سر پر چادر یا دوپٹہ رکھنے سے اتنے خوفزدہ' متوحش اور فکر مند کیوں ہیں؟ اور آزادی نسواں کے اتنے علمبردار کیوں ہیں؟ وہ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں کہ ان کے عظیم والد اور ہم سب کے محسن اور ممدوح علامہ اقبالؒ اس بارے میں کیا رائے رکھتے تھے؟ وہی جو جسٹس صاحب کی ہے یا ہم " تاریک خیالوں" کی! تعلیم نسواں کے بارے میں ان کا کیا نقطہ نظر تھا؟ ان کے نزدیک احترام عورت کے کیا تقاضے تھے؟ وہ عورت کے لئے سیدہ زہراؓ کو آئیڈیل قرار دیتے تھے یا صوفیہ لارین کو؟ یہی وہ نفسیاتی مسئلہ ہے جو بدقسمتی سے ڈاکٹر جاوید اقبال کو درپیش ہے۔ کہ نہ وہ تائید کرسکتے ہیں اور نہ تردید۔ یہ مخمصہ ان کی شخصیت کو تقسیم کئے دے رہا ہے جس کے باعث توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے بار بار چھوٹ جاتا ہے۔

قطع نظر اس سے کہ علامہ اقبالؒ ان کے والد ہیں اور وہ از رہ ادب انہیں غلط نہیں کہہ سکتے' علامہ اقبالؒ ہر ذی شعور فرد کے نزدیک جسٹس صاحب سے زیادہ پڑھے لکھے' فلسفی' بیدار مغز یورپ کے مزاج آشنا اسلام کے رمز شناس اور حکیمانہ نقطہ نگاہ کے حامل تھے۔ فرزند اقبال اگر یہ کہنے کا حوصلہ کر بھی لیں کہ علامہ کا دور تو گیا' اب حالات نئی کروٹ لے چکے ہیں تو دنیا بھر میں سوائے ان کے کوئی دوسرا ان کا ہمنوا نہیں ہوگا کیونکہ کہ قصہ جدید و قدیم کو حضرت علامہ خود " دلیل کم نظری" قرار دے چکے ہیں۔ حقائق اور اخلاقیات محتاج قدیم و جدید نہیں ہوتے اور ہم لوگ تو اس صدی کو "اقبالؒ کی صدی" کہتے ہیں بلکہ آنے والا دور اقبالؒ کی حکمتوں اور صداقتوں کو مزید واضح کرنے والا دور ہوگا۔ ایسے میں فرزند اقبال کی " فرزندگی" کسی کو کیا متاثر کرسکتی ہے؟

یہ تو بات ہوئی حضرت علامہ کی نسبت سے' اس سے قطع نظر آخر وہ کون سی خیر عورت کے سر سے دوپٹہ اتار دینے سے منسلک ہے جس سے ملا ہمیں خواہ مخواہ محروم کرنا چاہتا ہے؟ وہ کون سی ترقی ہے جس کا راستہ دوپٹے نے روک رکھا ہے؟ وہ کون سا اعزاز ہے جس سے ہم دوپٹے کے باعث محروم چلے آرہے ہیں؟۔ وہ کون سا کام ہے جس میں حرج فقط دوپٹے کی وجہ سے ہوتا ہے؟۔ لے دے کر ڈرامہ' بازاری فیشن اور نمائش ہی ہے جس میں دوپٹہ آڑے آتا ہے ورنہ آج کے انقلابی ایران میں عورت دوپٹے اور حجاب شرعی سمیت سارے فرائض زندگی سرانجام دے رہی ہے۔ کسی نے دوپٹہ اتار پھینکنا ہے تو اتار پھینکے' کون روک سکتا ہے؟ یہاں قتل ہضم ہوجاتے ہیں' بے پردگی کا تو ذکر ہی کیا لیکن براہ کرم اس کی اجازت اسلام سے حاصل نہ کی جائے۔ ہوائے نفس سے اس کی رخصت' آسانی سے مل جاتی ہے' لے لیجئے اور عیش کیجئے!۔ آپ کی خواہش کچھ یوں معلوم ہوتی ہے کہ آپ کے نفس اور جذبہ تعیش کو غذا بھی خود اسلام فراہم کرے۔

ہمارے دانشور بات کو دوسرا رخ دے کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ مقصد "عیش نظر" ہے اور نام لیتے ہیں ترقی کا' عورت کی آزادی کا!' اس کی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کا!' سوال یہ ہے کہ خیر' ترقی' خوبی اور صلاحیت کے حصول اور اظہار کے لئے دوپٹہ اتروانے کی جو مہم چل رہی ہے تو بطور ایک مسلمان کے یہ واضح کیا جائے کہ سیدہ خدیجہؓ سیدہ عائشہؓ سیدہ فاطمہؓ سیدہ زینبؓ سیدہ رابعہ بصریؒ یہ سب خیر' ترقی' روحانی اور خوبیوں کے اعتبار سے کس درجے میں شمار ہوتی ہیں؟' اگر ہمیں اعتراف ہے کہ اب ہماری مائیں' بہنیں' بیٹیاں خیر و ترقی اور خوبی و اصلاح میں ان کی تقلید تو کرسکتی ہیں کسی شکل میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں تو بتایا جائے کہ ان قابل صد احترام عفت مآب خواتین نے دوپٹے اور حجاب سمیت خیر اور خوبی کی منازل کیسے طے کرلیں؟۔ اور ہماری بہنیں بیٹیاں ایسا کیوں نہیں کرسکتیں؟۔ دوپٹہ بیچارا اگر آڑے آتا تو فاطمہؓ و زینبؓ کے آڑے آتا۔

ہمارے خیال میں مسئلہ صرف ذہنی مرعوبیت' تقلید مغرب کج نظری اور ہوس پرستی کا ہے۔ ہم خیر و فلاح کی دوڑ میں شریک نہیں ہونا چاہتے' ترقی ہمارے پیش نظر نہیں اگر کچھ مطلوب ہے تو میوزیکل شو' رقص' بیوٹی پارلر کا فروغ' کاسمیٹکس کی تجارت مقابلہ حسن وغیرہ اور کیونکہ یہ سب چیزیں دوپٹے اور حجاب کے ساتھ ممکن نہیں اس کے لئے ستر و حجاب سے گلو خلاصی ضروری ہے۔ کوئی کوڑھ مغز ملا کسی بہن بیٹی کو نرس' ڈاکٹر' لیکچرر' سائنس دان' سیاستدان بنانے سے نہیں روکتا۔ وہ صرف آداب و حدود شرعی کی بات کرتا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ مقطع میں سخن گسترانہ بات آپڑتی ہے اور لذت میں کھنڈت پڑجاتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ جسٹس جاوید اقبال نے شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے تک اسلام کو محدود کرنے کی بات کی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بھی تجاہل عارفانہ ہے ورنہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والا آدمی ایسی عامیانہ بات نہیں کرسکتا۔ بات صرف مذہب کے خانے کی نہیں' اصول کی ہے۔ "آپ مان جائیں' ملا بھی مان جائیگا"۔ آپ ضد کریں گے وہ بھی ضد کرے گا اور یوں بیچ میں اعتماد کا رشتہ ٹوٹ جائیگا۔ ایک فرقے کو آئین غیر مسلم کہتا ہے' پارلیمنٹ بحث مباحثے کے بعد اسے غیر مسلم گروہ قرار دیتی ہے' امت اس پر اجماع کرتی ہے تو وہ کون سی منطق ہے جو قادیانیوں کو دائرہ اسلام میں شامل کئے رکھے!۔ ہماری مجبوری ہے کہ حضرت علامہ کا ذکر درمیان میں آجاتا ہے' قادیانیوں کے بارے میں فاضل جسٹس کے والد گرامی کی کیا رائے تھی؟۔ یہ انہیں بھی معلوم ہے اور ہمیں بھی!۔ تو اسے خواہ مخواہ باعث نزاع نہ بنایا جائے۔ " یہ تو علم و فہم والی بات نہ ہوئی"۔ ایک اصول ہے کہ کوئی از خود بار ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں بن جاتا' کسی پارٹی کی مجلس عاملہ کا رکن نہیں ہوسکتا' کوئی اپنی مرضی سے جسٹس نہیں لکھوا سکتا' کوئی ممبر پارلیمنٹ کی پلیٹ' گاڑی پر نہیں لگوا سکتا جب تک کہ متعلقہ ادارے اسکی

منظوری نہ دیں اور وہ شخص کوالیفائی نہ کرے تو کیا اسلام ایسا یتیم ادارہ ہے کہ ہر کوئی اس کا متولی اور وارث بن جائے خواہ امت اسے قبول کرے یا نہ کرے!۔ ظاہر ہے یہ ضابطے کی بات ہے اور ایک جج سے بڑھ کے ضابطوں کے احترام سے کون واقف ہوگا؟۔ مگر ہمارے جسٹس صاحب اس معاملے میں بھی شغل فرماتے نظر آتے ہیں۔

ہم کھلے دل سے ڈاکٹر جاوید اقبال کے اس درد و سوز کا اعتراف کرتے ہیں کہ لوگوں نے دوپٹے اور مذہب کے خانے تک اسلام جیسی آفاقی حقیقت کو محدود کردیا ہے۔ واقعی یہ اشارہ بڑا اہم ہے مگر خود ڈاکٹر صاحب اور ان جیسے لوگوں نے بھی تو ساری روشن خیالی، تجدید دین اور ترقی کو دوپٹے اور حجاب کے خانے تک محدود کردیا ہے۔ جب بھی بات ہوتی ہے تان اسی پر آکر ٹوٹتی ہے کہ عورت ڈرامے میں حصہ کیوں نہیں لے سکتی؟۔ ہاکی کیوں نہیں کھیل سکتی؟۔ مقابلہ حسن میں کیوں شریک نہیں ہو سکتی؟۔ لبرٹی اور انار کلی میں کیوں نہیں جاسکتی؟۔ مغنیہ اور رقاصہ کیوں نہیں بن سکتی؟۔ ع

آپ بھی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں

اس دائرے میں متوازن نقطہ نظر یہ ہے کہ سارا اسلام دوپٹے اور حجاب میں نہیں اور نہ ہی ساری روشن خیالی کا منبع اور سرچشمہ بے حجابی ہے بلکہ احساس ذمہ داری اور دائرہ کار کا تعین ہی اسلام کی روح اور روشن خیالی کا مصدر ہے۔ بات اگر حجاب سے نہیں بنتی تو خدا لگتی بات یہ ہے کہ بے حجابی سے بھی آج تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ حالانکہ جتنی بے حجابی بڑھی ہے، شرح تعلیم اتنی گھٹ رہی ہے اور معیار تعلیم پست ہو رہا ہے۔ اخلاقیات کو تو سردست جانے ہی دیجئے کہ رفتہ رفتہ یہ اضافی شے بنتی جارہی ہے۔

ہمارے ممدوح ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنے پر حکمت اور فصیح و بلیغ خطاب میں یہ بھی فرمایا ہے کہ "اگر سرسیدؒ اور اقبالؒ نے اسلام کے اصلاحی نظام کے حوالے سے کوشش نہ کی ہوتی تو آج مرد اور عورتیں "میم اور صاحب" بن کر یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔ یہ ہوئی نہ اصل بات اور خواہش جسے ڈاکٹر صاحب بڑا لمبا موڑ کاٹ کر زبان پر لائے یعنی ان کے نزدیک سب سے بڑا شرف، عظیم کامیابی، خیرہ کن ترقی اور اعزاز "میم" اور "صاحب" بننا ہے۔ اصلاحی نظام کا اگر یہی نتیجہ مقصود تھا تو خدا گواہ ہے کم از کم اقبالؒ کی روح یہ سب کچھ دیکھ کر اپنی لحد میں تڑپ رہی ہوگی اور سرسید مرحوم نے بھی یہ کبھی نہیں چاہا تھا کہ میری بیٹیاں "میم" اور میرے بیٹے "صاحب" بن جائیں۔ گوری "میموں" اور گورے "صاحبوں" سے نجات پانے کے لئے تو علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا خواب دیکھا تھا اور عوام نے قربانیاں دی تھیں، انہیں کیا معلوم تھا کہ ہمارے اخلاف کی ناقابل ضبط خواہش یہ بن جائیگی کہ ہم گورے نہ سہی کم از کم "گندی میم" اور "گندی صاحب" تو بن جائیں۔

ہمارے پاس دلیل ہو یا نہ ہو لیکن قسم بخدا ہماری خواہش یہ ہے کہ ہمارے جوان "صاحب" نہیں ٹیپو اور سراج الدولہ کے جانشین بنیں، اور ہماری خواتین، فاطمہؓ و زینبؓ کی پیروی کریں کہ ایک مسلمان کے لئے یہی معراج کمال اور ترقی ہے۔ ہم نے اوپر جو "جسٹس جاوید اقبال کا نفسیاتی مسئلہ" کا عنوان قائم کیا ہے وہ اسی لئے کہ مسئلہ نفسیاتی ہے جسے ڈاکٹر صاحب خواہ مخواہ علمی، فکری، سماجی اور دینی مسئلہ بنا رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ نونہالان قوم "صاحب" بنیں اور دکھائی دیں اور ہم چاہتے ہیں کہ ان کے والد مرحوم کے افکار کے سانچے میں فرزندان قوم ڈھل جائیں "خواہ فرزند اقبال خود اس دھارے سے الگ رہے۔ انہی جاوید اقبال کو حضرت علامہ نے "شیشہ گران فرنگ" کے احسان نہ اٹھانے کی تلقین کی تھی اور انہی کو "سفال ہند" سے "مینا و جام" پیدا کرنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ اقبالؒ ہی تھے جنہوں نے نام نہاد ترقی کے مقابلے میں "غریبی" کو ترجیح دی تھی تاکہ خودی کو نہ بیچنا پڑے۔

مجھ جیسے ہزاروں لوگ یقیناً سوچتے ہوں گے کہ حضرت علامہ نے یہ جو فرمایا کہ ع زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن، تو اس کا اطلاق کہاں کہاں ہو سکتا ہے؟ موجودہ مشائخ پر، دور حاضر کے حکمرانوں پر، مسلم لیگ کے فی الوقت رہنماؤں پر، ملاؤں پر؟۔ لیکن فی الفور ذہن بدقسمتی سے خود ڈاکٹر جاوید اقبال کی طرف جاتا ہے۔ جو شخص عمر بھر یورپ کی فضاؤں، یونیورسٹیوں، اس کے فلسفوں، اس کی

> **یوں محسوس ہوتا ہے کہ جناب جاوید اقبال اس پر کچھ زیادہ خوش نہیں کہ انہیں ہر جگہ "فرزند اقبال" کہہ کر پکارا جائے یا پہچانا جائے۔ وہ خود اپنی پہچان بننا چاہتے ہیں۔ شائد "خودی" کا مفہوم انہوں نے یہی سمجھا ہے اور بہت غلط سمجھا ہے۔ وہ ظاہر ہے منہ سے تو کہہ نہیں سکتے، البتہ کنائے اور قرینے پتہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے "آزاد، خود مختار اور خود کفیل" تشخص کی تلاش میں ہیں۔ ان کی یہ جہد و کاوش قطعاً معیوب نہیں، ظاہر ہے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں، پی ایچ ڈی ہیں، معزز چیف جسٹس رہے ہیں اور سرکار کے اونچے ایوانوں تک رسائی بھی رکھتے ہیں لیکن ایک بات بھول جاتے ہیں کہ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں ہیں، ڈاکٹر بھی کئی ہیں، چیف جسٹس بیسیوں ہو چکے ہیں، اونچے ایوانوں تک رسائی کیا خود ایوانوں کے مالک صدر اور وزیر اعظم یہاں موجود ہیں، لیکن فرزند اقبال صرف وہ ہیں اور یہی ممتاز ترین نسبت ہے اس پر انہیں فخر ہونا چاہیے۔**

تہذیب کی خیرگیوں سے متاثر نہیں ہوا اور تہہ اور شلوار پہن کر حقے کی نے منہ میں لئے موڑھے پر بیٹھے ہوئے انگریز کی تہہ در تہہ استعماری اور تہذیبی سازشوں کا تار و پود بکھیرتا رہا اور خود کو کانٹ، ہیگل اور ایڈلر کی بجائے "مرید رومی" کہتا اور لکھتا رہا' اس کا جانشین مور کی طرح اپنی ساری خوبصورتی کو بھول کر فقط اپنے پاؤں دیکھ کر شرمانے لگ جاتا ہے۔ اس مصرعے کا مصداق اس سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے۔ مجھے معاف کیجئے اگر کوئی لفظ ناموزوں لگے اور لہجہ تلخ معلوم ہو۔ ہم لوگ آخر جذباتی کیوں نہ ہوں کہ باپ ہمیں "توبہ زمانہ ستیز" کا درس دے اور ہم اپنے بال و پر جھٹک کر مقابلے پر اتر آئیں اور بیٹا پھر سے "توبہ زمانہ ساز" کی لوری سنا کہ ہمیں پابند نشیمن کرنیکا بھاشن دے۔ ہم آخر کس کی مانیں؟۔

اس سارے قصے میں ایک اور عنصر بھی کار فرما ہے اور وہ اتنا نظرانداز کردینے والا بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ جسٹس جاوید اقبال کو یہ لازوال شرف حاصل ہے کہ وہ فرزند اقبال ہیں اور پوری قوم اس لئے ان کو احترام کی نظر سے دیکھتی ہے اور ہر مجلس و بزم میں ان کا تعارف اسی حوالے سے ہوتا ہے اور یہ حوالہ ہر اعتبار سے معتبر اور محترم حوالہ ہے۔ مرحوم علی بخش ہمارے لئے محترم ہیں اگرچہ وہ اقبالؒ کا حقہ تازہ کرتے تھے لیکن انہیں نسبت تو بہرحال فیلسوف مشرق سے ہے۔ وہ لوگ جنہیں ایک بار اقبالؒ کو مٹھی چاپی بھرنے کا اعزاز ملا وہ پھولے نہیں سماتے' جو انہیں اخبار اور خطوط پڑھ کر سناتے تھے وہ خود کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں اور انہیں ایسا سمجھنے کا حق ہے کیوں کہ اقبال کا قرب کوئی معمولی واقعہ نہیں اور جاوید اقبال تو ٹھہرے ان کے لخت جگر' ان کا مرکز امید' ان کی نخل تمنا' اور اس نسبت سے ہمارے مخدوم اور محترم! لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ جناب جاوید اقبال اس پر کچھ زیادہ خوش نہیں کہ انہیں ہر جگہ "فرزند اقبال" کہہ کر پکارا جائے یا پہچانا جائے وہ خود اپنی پہچان بننا چاہتے ہیں شاید خودی کا مفہوم انہوں نے یہی سمجھا ہے اور بہت غلط سمجھا ہے۔

وہ ظاہر ہے منہ سے تو کہہ نہیں سکتے' البتہ کنائے اور قرینے پتہ دیتے ہیں کہ وہ اپنے "آزاد' خود مختار اور خود کفیل" تشخص کی تلاش میں ہیں۔ ان کی یہ جدوجہد کاوش قطعاً معیوب نہیں' ظاہر ہے وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ' ہیں پی ایچ ڈی ہیں' معزز چیف جسٹس رہے ہیں' سرکار کے اونچے ایوانوں تک رسائی رکھتے ہیں لیکن ایک بات وہ بھول جاتے ہیں کہ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہزاروں ہیں' ڈاکٹر بھی کئی ہیں' چیف جسٹس بیسیوں ہو چکے ہیں' اونچے ایوانوں تک رسائی کیا خود ایوانوں کے مالک صدر اور وزیراعظم یہاں موجود ہیں لیکن فرزند اقبال صرف وہ ہیں اور یہی ممتاز ترین نسبت ہے۔ اس پر انہیں فخر ہونا چاہیے' اسے نظرانداز کر کے اپنے تشخص کی تلاش ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارنے والی بات ہے جو ڈاکٹر صاحب بلاوجہ کر رہے ہیں۔ راقم الحروف نے نجی محفلوں میں یہ بات دبے لفظوں سنی ہے کہ جناب جاوید اقبال "فرزند اقبال" کہلانے پر کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے (واللہ اعلم بالصواب!)

اپنے تشخص کی تلاش میں ڈاکٹر جاوید اقبال کے سامنے دو راستے تھے' ایک اپنے عظیم المرتبت والد کے افکار کی پیروی کا راستہ اور دوسرا انحراف کا راستہ۔ پیروی کے راستے میں وہ اپنے تشخص کو بزعم خویش تلاش نہیں کر سکتے کہ یہ تو خوشہ چینی ہوئی سو انہوں نے (خدا گمان بد سے بچائے) دوسرا راستہ اختیار کیا اور دوسرے راستے کا واضح مطلب تجدد' ماڈرن ازم' انحرافی اور اعتزالی نقطہ نظر ہے جو وہ اپنائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ اقبالؒ کے ہاں راسخ الاعتقادی ہے' روحانی ورثے کی حفاظت ہے' احکام اسلام کی من و عن پیروی ہے' اسلاف سے خوش گمانی بلکہ عقیدت ہے' تہذیب مغرب سے مکمل بیزاری ہے اور مغربی انداز سیاست پر نفرین ہے' ایسے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کس طرح اپنا تشخص بنا سکتے ہیں سو انہوں نے ایک عرصے سے وہ روش اپنا رکھی ہے جو اصحاب خیر اور ارباب نظر کے نزدیک سلامتی کی روش نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی اس بات نے تو تڑپا کر رکھ دیا ہے "اب ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اسلام چاہیے بھی یا نہیں؟۔ اگرچہ جس تناظر میں انہوں نے بات کی ہے وہ صحیح ہے کہ جب مسجدیں میدان جنگ بن جائیں' علماء ایک دوسرے کی گردنیں ناپیں' منبر و محراب سے کفر کے فتوے صادر ہو رہے ہوں' مسلک و مشرب کا اختلاف گردن زدنی ٹھہرے تو ایسے میں اصحاب درد اسلام کے بارے میں کیا رائے دیں گے؟ یہ درست مگر اسلام کوئی "آپشنل" چیز نہیں کہ اختیار کیا جائے یا نہ! کسی دکان کا سودا نہیں کہ گاہک کی مرضی چلے' بلکہ اسلام پر انسان کے ذمے یوم الست کا بنیادی سوال ہے جس کا جواب قیامت کے دن اس پر واجب ہوگا اور دنیا کی زندگی دراصل اس جواب کی تیاری کی مہلت ہے جو چاہے اس سے فائدہ حاصل کر لے۔ جسٹس صاحب کا یہ استفسار کانوں کو اتنا بھلا نہیں لگا "اگر اسلام چاہیے یا نہیں" کے وزن پر سوالنامہ مرتب ہونا شروع ہو جائے تو پھر اسمبلیوں میں فری شائل کشتیاں دیکھ کر سوال پیدا ہوگا اسمبلیوں کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ آئین کے ہوتے ہوئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی پر یہ سوال اٹھانا پڑے گا کہ آئین کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ جان و مال کے عدم تحفظ کی بنا پر یہ سوال کھڑا ہو سکتا ہے کہ ایسے ملک کی ضرورت بھی ہے یا نہیں؟ آخر الامر یہ سلسلہ کہاں جا کر رکے گا! مثبت سوچ رکھنے والے لوگ بات کا لف و نشر یوں مرتب نہیں کرتے۔ یہ تو بڑھک باز اور خرد بیزار سیاسی مہاشوں کی زبان ہے' کوئی عالم فاضل سلسلہ گفتگو یوں آگے نہیں بڑھاتا۔

علامہ اقبالؒ نے خدا کے حضور گڑگڑا کر جو دعائیں ابنائے وطن' فرزندان اسلام اور جوانان ملت کے لئے کہیں' ہم وہ ساری دعائیں اقبالؒ کے لخت جگر کے لئے وقف کرتے ہیں اور آمین کہتے ہیں

میں اپنی بات ایک واقعہ پر ختم کرنا چاہوں گا کہ مولانا رومؒ ایک بار اپنے مداحوں کے جلو میں کہیں سے گزر رہے تھے راستے میں بچے مٹی میں کھیل رہے تھے' بچوں نے جب مولانا رومؒ کو دیکھا تو دوڑتے ہوئے مولانا سے لپٹنے لگے' مولانا بھی ان سے پیار کرنے لگے' عقیدت مندوں کو مولاناؒ کی بچوں سے یہ بے تکلفی گراں گزری اور حرف شکایت زبان پر لا کر کہنے لگے آخر ان میلے کچیلے بچوں سے اتنی بے تکلفی کی کیا ضرورت تھی' سفید براق کپڑے میلے ہو گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے یہ بتاؤ اگر آج یہاں میری جگہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے تو ان بچوں سے ان کا طرز عمل کیسا ہوتا؟ سب کو ان کی شکایت کا جواب مل چکا تھا کہ فی الواقع حضور رسالتمآبؐ اس سے زیادہ بچوں کیساتھ انس اور پیار کا اظہار فرماتے تھے اور اپنی شخصیت اور کپڑوں کا خیال نہ کرتے۔ یہی بات ہم فرزند اقبال سے پوچھتے ہیں کہ اس دور مکر و دجل میں' اس عہد ہوس میں اور اس لمحہ ابتلا میں جو اسلام کو درپیش ہے اگر ان کے گرامی مرتبت والد اس وقت موجود ہوتے تو وہ ڈھال بن کر شکوک پھیلانے والوں کے سامنے کھڑے ہو جاتے یا الٹا شبہات کے شعلوں کو ہوا دیتے؟

میرے خیال میں اس سوال کا جواب ڈاکٹر جاوید

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

جمہوری نظام کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں

خلافت ختم نبوت کا منطقی تقاضا ہے

ایک مختلف سیاق و سباق میں چودھری خلیق الزمان کی ایک تاریخی تحریر

چودھری خلیق الزمان مرحوم کی کتاب "شاہراہ پاکستان" سے دو اقتباسات ہمیں اورنگی ٹاؤن کراچی کے اپنے محترم قاری' محمد صادق بلوچ کی طرف سے موصول ہوئے ہیں۔ چودھری صاحب کا شمار کانگریس' تحریک خلافت اور آخر میں مسلم لیگ کے سرکردہ رہنماؤں میں ہوتا ہے اور ایک زمانے میں وہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر بھی ہوگئے تھے۔ ذیل میں دیئے جانے والے پہلے اقتباس میں انہوں نے خلافت کی شرعی حیثیت پر جو دلائل دیئے ہیں' ان پر تو کلام ہو سکتا ہے لیکن یہ بات بہرحال ظاہر ہے کہ خلافت کا نام برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں میں خلافت عثمانیہ کے حوالے ہی سے نہیں بلکہ اسلامی حکومت کے عنوان کے طور پر بھی معروف رہا ہے۔ یہ تو قیام پاکستان کے بعد کی بات ہے کہ اس قوم کو جمہوریت کا ہیضہ ہوگیا اور اسی کے ساتھ "اسلامی" کا سابقہ لگا کر سمجھ لیا گیا کہ ہمارے دین کے تقاضے اسی طرح کے کسی سیاسی نظام سے پورے ہوجائیں گے ——— مدیر

چودھری خلیق الزمان (مرحوم)

شروع ۱۹۱۹ء میں مولانا عبدالباری نے خلافت کے مسئلہ پر علماء کے فتاوے حاصل کرنے کے لئے سعی شروع کر دی۔ اور اس طرح ایک بڑی خدمت انجام دی۔ یہ تمام فتاوے دائرائے ہند کے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ مولانا احمد رضا بریلوی ترکی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور ترکوں کی امداد کے بھی خلاف تھے یہی نہیں بلکہ انہوں نے کئی فتوے مولانا عبدالباری پر کفر کے بھی صادر فرمائے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی استفتاء پر جس میں خلافت کو شریعت اسلامی کا ایک اہم ادارہ تسلیم کیا جائے دستخط نہ کرتے مگر ان کے علاوہ دو علمائے فرنگی محل یعنی مولانا عبدالمجید اور عبدالحمید جو مولانا قطب شہید کی اولاد میں تھے اور مولانا عبدالباری کے قریب ترین عزیزوں میں بھی تھے وہ بیماری یا عدم فرصت کے حیلے نکال کر دستخط سے گریز کرتے رہے۔ یہاں اس کتاب میں ان تمام علماء کے نام جنہوں نے فتوے پر دستخط کئے تھے نہیں دے سکتا مگر وہ مخصوص علماء جنہوں نے فتوے پر دستخط کئے حسب ذیل ہیں۔

مولانا محمد انیس نگرامی۔ مولوی محفوظ الرحمٰن۔ مولوی نظام الدین۔ مولانا عبدالقادر بدایونی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ مولانا سلیمان ندوی۔ مولانا آزاد سبحانی۔ مولانا شاہ سلیمان پھلواری ۔ مولوی محمد سجاد۔ مولانا ابوالعلاء فصیحی غازیپوری۔ مولوی معین الدین اجمیری۔ مولوی محمد قیوم جون پوری۔ مولوی محمد شعیب ندوی۔ مولانا عبدالکافی الہ آبادی۔ مولانا احمد علی لاہوری۔ مولانا نورالحسن لاہوری۔ مولوی غلام محی الدین لاہوری۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولوی عبدالرحیم داؤدسندھی۔ مولانا میر محمد لاڑکانہ۔ مولوی معین الدین سیوان سندھ۔ مولوی محمد صاحب بیجاپوری۔ مولانا فاخر الہ آبادی۔

جہاں تک نفس خلافت کی شرعی حیثیت کا سوال ہے۔ علما نے اسے احادیث کی روشنی میں واجب اور لازم قرار دیا ہے۔ مگر میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ اس کا کھلا ہوا اشارہ خود قرآن پاک میں موجود ہے۔ کیونکہ میری رائے میں اتنے عظیم ادارے کے قیام کے لئے قرآن کو کوئی نہ کوئی ہدایت ضرور دینی تھی جو اولی الامر منکم میں صریحاً مذکور ہے۔ اکثر علماء اولی الامر میں تمام عمال کو شریک کرلیتے ہیں کیونکہ یہ لفظ صیغہ جمع میں ہے یہ یاد رہے کہ اس آیت میں سرور کائنات کی حیات میں اولی الامر کا ذکر نہ علما کے لئے ہو سکتا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک علماء مسلمانوں میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے اور نہ خلفاء یا دیگر عمال کے لئے کیونکہ خلفاء بعد میں آنے والے تھے اور جہاں تک دوسرے عمال کا سوال ہے۔ اگر ان کی طرف اشارہ ہوتا تو منہم کا لفظ ہوتا۔ لہٰذا وہ بھی اس لفظ میں شریک نہیں ہوتے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اولی الامر منکم (یعنی وہ صاحب امر جو تم سے ہوں) کا لفظ آئندہ آنے والوں کے لئے ہے جن پر اس کا صحیح اطلاق ہو سکے اسی لئے ظن غالب یہ ہے کہ اس لفظ میں صرف خلفاء جو یکے بعد دیگرے آنے والے تھے۔ شریک سمجھے جاسکتے ہیں۔

اس خیال کی تائید اس آیت کے بعد کے الفاظ فان تنازعتم فی شئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر ھو خیر و احسن تاویلا سے بھی ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کن لوگوں کے تنازعہ کا یہاں ذکر ہے۔ کیا ہر دو آدمیوں کے تنازعہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے یا یہ کسی خاص اہم قسم کے تنازعہ کی طرف اشارہ ہے آیت کی اہمیت کے اعتبار سے یہ دونوں فریق ملت اور خلیفہ ہیں۔ جن میں ان کو ہدایت دیگئی ہے کہ وہ خلفاء کے احکامات کی بلا چون وچرا اطاعت کریں اگر وہ احکامات قرآن اور رسول اللہ کے ہدایت کے بموجب ہوں اور اگر اس میں کوئی تنازعہ واقع ہو تو شرعی قوانین کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔ اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلافت کا عہدہ سنبھالنے کے بعد کہا کہ اگر میں حق پر ہوں تو میں تم کو اس پر چلنے کے لئے مجبور کروں گا اور اگر ایسا نہ ہو تو

تم مجھے سیدھا کردو۔ اس کی تائید مزید یوں ہوتی ہے کہ جب ایک قبیلے نے زکوٰۃ دینے سے انحراف کیا اور خلیفہ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اصحاب شوریٰ سے رائے دریافت کی اور ان کی رائے زمانے کے حالات کے پیش نظر تھی کہ ابھی رسول اللہ صلعم کا انتقال ہوا ہے اور لوگوں میں خوف اور ہراس ہے انہوں نے فوج کشی کی رائے نہ دی تو خلیفہ نے شوریٰ کی رائے کو رد کردیا اور فوج لے کر اس قبیلے کی سرکوبی کے لئے نکل پڑے۔ خلیفہ نے یہ اقدام اس لئے جائز سمجھا کہ وہ ایک قرآنی فریضہ کی حمایت میں تھا۔ حالانکہ اصحاب شوریٰ نے نفس مسئلہ سے اختلاف نہیں کیا تھا بلکہ صرف وقت کی ناسا عدت کا سوال پیش کیا تھا۔ پھر بھی خلیفہ نے چونکہ وہ حق پر تھے اسے رد کردیا۔ لہٰذا تنازعتم کے لفظ کو ہر دو افراد یا گروہوں کے تنازعہ پر عائد کرنا عقلاً جائز نہیں ٹھہرتا علاوہ ازیں آیت کے آخری الفاظ احسن تاویلا بڑی معرکۃ الآرا سیاسی پالیسی کے حامل ہیں مولانا عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ قرآن میں ان الفاظ کا ترجمہ بہتر تحقیق کیا ہے جو قریب قریب وہی ہے جو میں نے لفظ پالیسی سے ادا کیا ہے۔

اب اس مسئلہ پر ایک دوسرے گوشہ سے نظر ڈالی جائے تو یقیناً میری رائے کی اس سے تائید مزید ہوگی۔ عام طور سے مسلمان رسول اللہ کے آخری نبی ہونے کو وہ صرف ان کی عظمت اور شان نبوت پر محمول کرتے ہیں اور یہ بالکل بھول جاتے ہیں کہ ان کو آخری نبی کہہ کر کتنی عظیم ذمہ داریاں ان پر اور ان کی امت پر ڈالدی گئی ہیں کہ دنیا کی عمر لاکھوں برسوں میں گنی جائے یا کروڑوں میں یہ امت خدائی احکامات کے تحفظ اور اجرا میں سعی کرتی رہے اور خدا کے بتائے ہوئے اوامر اور نواہی کو اپنا حرزجاں سمجھتی رہے اس لئے اسلامی تعلیمات دنیا کے تمام دوسرے مذاہب کی تعلیمات سے یک گونہ مختلف ہیں۔ کیونکہ اس میں عبادات میں بھی خشوع اور خضوع سے زائد ملت کی وحدت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس کے نماز اور روزے میں بھی اجتماع اور وحدت ملت کو عبادت کا لازمی عنصر قرار دیا گیا ہے غرضیکہ اس طرح خود افراد امت کو اپنے دین کا مبلغ بنا دیا گیا ہے۔ تاکہ وہ خود اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے خدا کے دین کو فروغ دیتے رہیں اور اسے ابدالآباد تک زندہ رکھیں۔ انہیں ضروریات کے پیش نظر نبی صلعم نے ایک اسٹیٹ کی بنیاد بھی اپنی زندگی میں ڈالدی تھی تاکہ وہ اسٹیٹ ایک طرف خدائی احکامات کی اشاعت اور تبلیغ کرتی رہے اور دوسری طرف مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تار پود بکھرنے نہ دے اور انہیں صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کرتی رہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی اہم ذمہ داریاں حضورؐ سرور کائنات کی وفات کے بعد محض ہر فرد کی ذاتی خوشنودی اور احساسات پر نہیں چھوڑی جاسکتی تھیں اور نہ جماعتی رجحان پر اور نہ ایک مضبوط سیاسی نظام پر اکتفا کیا جاسکتا تھا اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی نبی نوحؑ۔ ابراہیمؑ صالحؑ موسیٰؑ عیسیٰؑ نے اپنے خلیفہ نہیں چھوڑے۔ گو حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں بہت سے اللہ کے نبی گزرے۔ مگر چونکہ اب سلسلہء نبوت ختم ہوچکا تھا لہٰذا آخری نبی کی امت کے لئے خلیفہ رسول ہونا ضروری تھا لہٰذا ان حالات میں یہ سمجھنا کہ قرآن مجید میں خلافت رسول اللہ کا براہ راست کوئی ذکر نہیں ہے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

آیئے اب ذرا خلافت کی تاریخی حیثیت پر غور کرکے دیکھیں کہ اس سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں آیا اس سے میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے یا نہیں۔ جب سقیفہ بنی ساعدہ میں مہاجر اور انصار خلافت کے مسئلہ پر جھگڑ رہے تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو حضرت عمرؓ لیکر وہاں پہونچ گئے کسی نے مجمع میں سے یہ کہا کہ دو خلیفہ ہوجائیں ایک انصار میں سے ایک مہاجرین میں سے کسی دوسرے نے کہا کہ انصار کو ہونا چاہئے کسی تیسرے نے قریش کا نام لیا۔ مگر کسی ایک نے بھی یہ نہ کہا کہ آپ لوگ یہ بدعت کیوں کرتے ہیں، کسی کو میں نے اپنا خلیفہ نہیں چھوڑا ہے پھر آپ نبیوں کی اس سنت کے خلاف ایک خلیفۃ الرسول اللہ کیوں بنارہے ہیں۔ یقیناً اس قسم کا اعتراض اٹھتا اگر مدینہ کے ہر شخص کا یہ ایمان نہ ہوتا کہ قرآن پاک میں اس کے لئے ہدایت ہے۔ اولی الامر منکم میں صرف خلفاء شریک ہیں اور اللہ اور رسول کے بعد انہیں کی قیادت امت پر عائد کی گئی ہے۔ علماء قوانین بتلا سکتے ہیں نگران کے اجراء کا حق خلفاء کو پہنچتا ہے اب رہا یہ امر کہ اب جب خلافت قائم نہیں ہے اس وقت مسلم نیشنل اسٹیٹ کے حاکم یا صدر کو خلافت کے اختیار پہنچتے ہیں یا نہیں ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ جس پر بحث کا اس کتاب میں کوئی دخل ہوسکتا ہے تو میری قطعی رائے ہے کہ ایک حد تک اس کو سیاسی مسائل میں وہ ہی حقوق حاصل ہیں جو خلفاء کو حاصل تھے ورنہ اس ملک کا استحکام ہمیشہ خطرہ میں رہے گا۔ جمہوری نظام کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کاش میں اس مسئلہ پر یہاں مفصل بحث پیش کر سکتا گو وہ میرے موضوع سے بہت دور چلی جائے گی۔

بہرنوع مسئلہ خلافت پر علماء کے متفقہ فیصلہ نے ان اعتراضات کا سد باب کردیا ہے۔ جو کسی وقت انگریزوں کے بہی خواہوں کی طرف سے پیش کئے جا سکتے تھے مسلمانوں میں فتوے کا خیر مقدم کیا گیا اور ان میں ترکی اور خلافت کے تحفظ کے لئے بے پناہ ولولہ پیدا ہوا۔ ○○

اب رہا یہ امر کہ اب جب خلافت قائم نہیں ہے اس وقت مسلم نیشنل اسٹیٹ کے حاکم یا صدر کو خلافت کے اختیار پہنچتے ہیں یا نہیں ایک بہت اہم مسئلہ ہے۔ جس پر بحث کا اس کتاب میں کوئی منصب نہیں ہے اگر ذاتی رائے کو اس مسئلہ میں کوئی دخل ہوسکتا ہے تو میری قطعی رائے ہے کہ ایک حد تک اس کو سیاسی مسائل میں وہ ہی حقوق حاصل ہیں جو خلفاء کو حاصل تھے ورنہ اس ملک کا استحکام ہمیشہ خطرہ میں رہے گا۔ جمہوری نظام کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کاش میں اس مسئلہ پر یہاں مفصل بحث پیش کرسکتا گویا وہ میرے موضوع سے بہت دور چلی جائے گی۔

بقیہ تجزیہ

' راجیو بھی اپنے کٹر ہندو ہونے کا تاثر دیتے رہے تاکہ ہندو ووٹ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ پھر کانگریس کی پاکستان دشمن پالیسی مسلسل ہندو فرقہ واریت کو بڑھاوا دیتی رہی۔ بھارت کی اس پاکستان دشمن پالیسی سے پاکستان میں بھی بھارت دشمنی کو ہوا ملتی رہی۔ بھارتی رہنماؤں نے جان بوجھ کر اس حقیقت کو سمجھنے سے انکار کیا کہ ان کے ملک میں فرقہ پرستی کا مسئلہ پاک بھارت تعلقات کی کشیدگی کے سبب بڑھ رہا ہے اور ان تعلقات کی اصلاح سے نہ صرف بھارت کے اندر فرقہ وارانہ نفرت کا خاتمہ کرنے میں مدد ملے گی بلکہ پاکستان میں بھی نیا ذہن پیدا ہو سکے گا۔

اب بھارت اپنی پاکستان دشمن پالیسیوں کے گرداب میں آگیا ہے جس سے نکلنے کے لئے نرسیما راؤ کے ہاتھ پیر مارنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ بھارت اس بھنور میں اور غرق ہوتا چلا جائے گا۔ دوسری طرف پاکستان بھی مسلم قوم پرستی کی منفی اساس پر اپنے وجود کو قائم رکھنے میں ناکام نظر آتا ہے اور نظریہ پاکستان کی دھجیاں اڑ گئی ہیں۔ اس حالت میں بھی اب یہ صرف پنجاب میں ہے اور کچھ سرحد میں ہے' باقی مہاجروں میں ہوگا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہندو فرقہ پرستی اور پاکستان میں مسلم قوم پرستی معاشرہ کی تعمیر نو کے لئے کوئی مثبت اساس فراہم نہیں کر سکی۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو اپنے سے زیادہ بدتر فرقہ پرستوں کے لئے میدان خالی کرنا پڑا ہے اور فرقہ واریت کے نتیجے میں پاک بھارت معمول کے تعلقات ناممکن ہو گئے ہیں۔ حالیہ واقعات نے انہیں اور بھی ناممکن بنا دیا ہے اور دونوں جنگ کے مزید قریب آگئے ہیں۔ اب بھی وقت ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی سطح پر کچھ لوگ اٹھیں اور ان قوم پرستوں یا فرقہ واریت کی گندگیوں اور خون ریزیوں سے برصغیر کو نکالنے کی کوشش کریں۔ اس کے لئے ہمارا نہ لبرل طبقہ کچھ کر سکا ہے اور نہ سوشلسٹ طبقہ مگر اسلامی عنصر بہت کچھ کر سکتا ہے' اسے آگے بڑھنا چاہیے اور برصغیر کے مسلمانوں کو ایک طرز فکر دینا چاہیے۔ جس میں معقولیت ہو' انسانیت ہو اور مذہب کی حقیقی تعلیمات ہوں۔

ہندو معاشرہ میں بھی ایسے بہت سے ہندو موجود ہیں جو مذہبی تو ہیں لیکن ہندو قوم پرستی اور ہندو فرقہ واریت کو پسند نہیں کرتے۔ اس کی ایک مثال مرار جی ڈیسائی کی شخصیت کی صورت میں ہم دیکھ بھی چکے ہیں اکتے برہم چاری ابھی تک زندہ ہیں۔ وہ مسجد پر ہندو قبضہ کے خلاف ابتداء میں کافی عرصہ تک بھوک ہڑتال پر رہے اور اب بھی ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ رام مندر سادھوؤں پجاریوں اور فرقہ پرست رہنماؤں کے کارکنوں کے لئے کمائی کا نیا ذریعہ ہے اس لئے اس پر زور ہے۔ اس طرح کے بہت سے ہندو اور بھی ہیں اگر یہ ہندو اور مسلمان مل کر برصغیر میں احترام آدمیت ' انسان دوستی ' امن اور رواداری کی اہمیت اجاگر کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں تو شاید ایک نئی فضا بن سکے ورنہ تو برصغیر کا ٹکراؤ اپنے منطقی انجام کو پہنچ کر رہے گا اور اس صورت میں خدا جانتا ہے کہ کیا ہوگا۔ ایک بات طے ہے کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا وجود اگر نیست و نابود نہیں ہوگا تب بھی ان پر ایک نئی قیامت ضرور ٹوٹ پڑے گی اور ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔ ○○

بقیہ پس اقبال

اقبال سمیت ہم سب کو معلوم ہے کیوں کہ اقبال کی آنکھ میں خاک مدینہ و نجف کے سرمے کی دھاریاں تھیں اور یہ سرمہ نظر کا قبلہ درست کر دیتا ہے۔ آج بھی بحمد اللہ سمت قبلہ نہیں بدلی' مرکز نگاہ میں تبدیلی آگئی ہے اور اسے درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ○○

بقیہ نقد و نظر

غیر مسلم اقوام کی حکومتیں قائم ہو گئیں تو یہ پانچوں احکام بھی غیر متعلق اور رفتہ رفتہ " آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل " کے مصداق ذہن سے محو ہوتے چلے گئے۔ اور کسی کو یہ خیال ہی نہ آیا کہ اس حدیث مبارک میں اسلامی حکومت یا نظام خلافت کے از سر نو قیام کی جدوجہد کے ضمن میں بھی بنیادی رہنمائی موجود ہے ---- چنانچہ جب ۱۹۱۲ء میں یہ حدیث "الہلال" میں شائع ہوئی تو بہت سے مسلمان چونک گئے اور انہیں گویا اپنا بھولا ہوا سبق یاد آگیا۔ بہرحال مولانا آزاد نے مسلمانان ہند کو اس حدیث مبارک کی جانب صرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ۱۹۱۳ء میں اسی پر عمل کرتے ہوئے بیعت کی اساس پر " حزب اللہ " کے نام سے ایک جماعت قائم کر دی۔

دوسری بات کے لئے مولانا آزاد نے اولاً ۱۹۱۲ء ہی میں امام دار الہجرۃ حضرت مالک ابن انسؒ کے اس قول کا حوالہ دیا کہ : "اس امت کے آخری حصے کی اصلاح ہرگز نہ ہو سکے گی مگر صرف اسی طریق پر جس پر پہلے حصے کی اصلاح ہوئی تھی "---- اور پھر دوبارہ لگ بھگ دس سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں جمعیت علماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں اپنے تحریری خطبے میں اس کا حوالہ دیا۔ اب سے تقریباً دس سال قبل جب " منہج انقلاب نبوی " راقم کی تحریر اور تقریر کا خاص موضوع بنا تو اس کے ضمن میں مولانا آزاد کے حوالے سے امام مالکؒ کا یہ قول بھی بہت نقل ہوا۔ اس پر بعض بزرگوں نے توجہ دلائی کہ اس قول مبارک کی حیثیت بھی حدیث کی ہے۔ اس لئے کہ یہ اصلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس خطبے میں وارد ہوا ہے جو انہوں نے اپنی حیات دنیوی کے آخری ایام میں ارشاد فرمایا تھا اور جس کے ذریعے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کی نامزدگی ہوئی تھی۔

الغرض ' میرے نزدیک ۱۹۱۳ء میں " حزب اللہ " کا قیام علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کی جانب پہلا قدم تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ مولانا آزاد اس پر صرف آٹھ سال تک استقامت کا مظاہرہ کر سکے۔ اور انہوں نے خود اپنے قول کے مطابق تو ان علماء کی مخالفت کے باعث پٹڑی تبدیل کر لی جن کے دینی تصورات بارہ سو سالہ زوال و انحطاط کے باعث صرف عبادات و رسومات اور اس سے بڑھ کر زیادہ سے زیادہ نکاح و طلاق اور میراث کے مسائل تک محدود ہو کر رہ گئے تھے---- لیکن بعض دوسرے حضرات (جن میں ان کے بعض عقیدت مند بھی نہیں بیعت کرنے والے بھی شامل ہیں۔) کے نزدیک اس کا اصل سبب مولانا کی اپنی کم ہمتی تھی۔ بہرحال جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اس بحث کے فیصلے کی تو نہ گنجائش ہے نہ ضرورت---- اصل بات یہ ہے کہ علامہ اقبال کے انقلابی فکر کی تعمیل کے لئے " راست اقدام " کی سعی اول ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ ختم ہو گئی لیکن اس فکر کی روح باطنی اور قوت متحرکہ نے بہت جلد مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی صورت میں نیا پیکر تلاش کر لیا جن کے فکر اقبال سے اثر پذیر ہونے کا معاملہ ویسے بھی اظہر من الشمس ہے' مزید برآں اس کا یہ تاریخی ثبوت تو ناقابل تردید ہے ہی کہ انہیں علامہ اقبال نے جنوبی ہند سے شمالی ہند نقل مکانی کی دعوت ہی نہیں دی تھی ' اس سلسلے میں ان کے ساتھ عملی تعاون بھی کیا تھا۔

(جاری ہے)

5156

دینی کے جامع تصور کا ایک صاف ستھرا خاکہ دل و دماغ میں اتر گیا۔ تحریک خلافت کے تعارف' اس کے ہدف کی تذکیر کے سلسلے میں سب سے منفرد انداز جناب غلام محمد صاحب کا تھا جس میں خوبی یہ محسوس ہوئی کہ دوران لیکچر وہ خود سوال کر کے رفقاء سے جواب طلب کرتے۔ اس طرح تمام رفقاء کو مجلس میں اپنی موجودگی کا بھرپور احساس رہتا ہے۔

نظام خلافت کے خدوخال کے عنوان پر جناب عبدالرزاق صاحب نے لیکچر دیئے۔ نظام خلافت میں سیاسی' معاشی اور معاشرتی سطح پر جو تبدیلیاں لائی جائیں گی' ان کا طریقہ کار کیا ہوگا۔ نظام خلافت میں خلیفہ کا انتخاب' سود کا اختتام زکوٰۃ و عشر کا نظام' جاگیرداری کا خاتمہ اور خراج کی آمدنی کے تصرف کے طریق کار سے واضح طور پر اور تفصیلاً آگاہ کیا گیا اور یہ بھی بتایا گیا کہ معاشی سطح پر شراب اور جوئے کا خاتمہ' مرد و زن کے اختلاط کا سدباب اور اقامت صلوٰۃ کا نظام کس طرح ہوگا اور نظام خلافت کس طرح برپا کیا جائے گا۔ تحریک شہیدین کے سلسلے میں جناب صدیقی صاحب کے لیکچروں نے جوش اور جذبہ پیدا کیا' مسلمانوں کی صفوں کے درمیان منافقوں کی کارستانیوں کی داستان سن کر دل کو بہت ہی دکھ ہوا اور خود اپنے معاشرے میں جو منافقین ہیں' ان کی تصویر بھی سامنے آتی چلی گئی۔

امیر محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے خانگی حالات سے آگاہ کرنے کا بار جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے اٹھایا جو امیر محترم کے داماد بھی ہیں۔ انہوں نے تمام حالات اور واقعات سے تفصیلاً واقف ہونے کے ناطے امیر محترم کے تعلیمی دور سے لے کر تاحال ان کے معاشی' خانگی اور سیاسی حالات کو تاریخ بتاریخ پیش کیا اور امیر محترم کے حالات میں خاص طور پر کسب حلال کا معاملہ سامنے آیا جو عمل صالح کا نمونہ محسوس ہوا۔ انہوں نے اپنے اثاثے کی تقسیم جو ورثاء میں کی' وہ بھی قابل تحسین و ستائش ہے۔

سب سے زیادہ متبرک اور پر خلوص وہ شام تھی جس میں امیر محترم خود تمام رفقاء سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور سب سے فرداً فرداً تعارف بھی حاصل کیا مگر اس مختصر صحبت سے دل کو تشفی نہ ہوئی۔ خواہش یہ تھی کہ پروگرام کچھ اس طرح بنایا جاتا کہ امیر محترم کے ساتھ رفاقت کا دورانیہ کچھ نہ کچھ روزانہ ضرور ہوتا مگر امیر محترم کی مصروفیات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ پھر بھی امیر محترم کے ساتھ جو ہمارا وقت گزرا وہ ہی سب کے لئے باعث صد افتخار ہے۔

۲۶ نومبر کو رفقاء اور معاونین مطمئن تھے کہ انہوں نے یہاں جو وقت گزارا' ان کے لئے یادگار رہے گا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے خط و کتابت کے وعدوں کے ساتھ آخری ملاقات کرتے ہوئے الوداع کہا۔ اس سلسلے میں ایک ساتھی جناب اعجاز خان کی پلکوں پر رقصاں آنسو ان کے پر خلوص جذبات کے ترجمان تھے۔ ہمارے ایک رفیق جناب جاوید اختر نے جو لاہور سے تعلق رکھتے ہیں' ایک لسٹ بھی بنا کر تقسیم کی جس میں تمام رفقاء کے نام اور پتے درج ہیں اور یوں یہ سات روزہ تربیتی پروگرام ایک احساس ذمہ داری' ایک جذبے اور عملی اقدام کے عزم و ارادے کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔○○

ندائے خلافت

سال نو سے مہینے میں دو بار شائع ہوگا۔ یہ ہفت روزہ "ندائے خلافت" کے پندرہ روزہ ایڈیشن کی صورت میں ہوگا یا پھر اس کا دورانیہ ہی ہفتے کی بجائے ایک پندھواڑہ کردیا جائے گا۔ ضخامت' نظرثانی شدہ قیمت اور زرسالانہ کی شرح کے اعلان کے لئے نئے سال کے پہلے پرچے کا انتظار فرمایئے۔۔۔ ادارہ

ماہنامہ میثاق لاہور
کی اشاعتِ خصوصی۔ بابت اکتوبر ۱۹۹۲ء

- جماعتِ اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران
- اسلام اور پاکستان کی موجودہ سیاسی کشمکش

اس میں مذہبی جماعتوں کا کردار اور اس کا متوقع نتیجہ!

- مولانا مودودی مرحوم اور میں

تمام تحریریں ازقلم ڈاکٹر اسرار احمد امیر تنظیم اسلامی

● صفحات ۱۲۸ ● اس شمارے کی قیمت ۱۰/- (سالانہ زرتعاون ۵۰/-)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن' ۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE

36 -K,Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

ایک بین الاقوامی جریدے میں بھارتی کالم نگار

پران گپت کا اظہار ندامت

ہندو مذہب ایسا تو نہیں!

اخذ و ترجمہ : سردار اعوان

میرا تعلق بھارت کے ایک ہندو گھرانے سے ہے مگر اپنی اس شناخت پر مجھے شرم محسوس ہو رہی ہے جو اس قدیم مذہب' کے جوشیلے پیروکاروں نے دنیا کے سامنے پیش کی۔ شمالی ہندوستان میں واقع ایودھیا کے مقام پر سولہویں صدی میں تعمیر شدہ مسجد کو یہ کہہ کر مسمار کرنا کہ یہ ہندوؤں کے دیوتا رام کی جائے پیدائش ہے' ہندو مذہب کی روایات کے ہی خلاف نہیں' اس کے مفادات کے لئے بھی ضرر رساں ہے۔

ہندو ازم کے احیاء کے نام پر اس کارروائی کا مقصد یہاں کی مسلم اقلیت کو جو پہلے ہی خوف و ہراس میں زندگی بسر کر رہی ہے' جبر و استبداد کے شکنجہ میں کسنا ہے مگر میرے نزدیک ایودھیا میں مسجد کی تباہی کے عمل سے بھارت میں سیکولرزم کے خاتمے کی منزل زیادہ قریب آئے گی' اس سے مسلم دنیا کے ساتھ سیاسی رسہ کشی کا آغاز ہوگا اور اس افسوس ناک واقعہ کے نتیجہ میں نسلی فسادات کی وہ آگ زیادہ دور دور تک پھیلے گی جس نے ایک لمبے عرصے سے ہندو مسلم محاذ آرائی کی شکل میں اس خطے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

بلند حوصلگی اور رواداری ہندو دیوتا رام کے اصل اوصاف تھے۔ رامائین میں درج ان کی بہادری کے قصے سنتے لوگوں کی انگنت نسلیں بیتی ہیں۔ ایک مشہور نظم میں یہ تو بتایا جاتا ہے کہ رام کو ان تمام لوگوں پر فتح ہوئی جنہوں نے ان کی بیوی سیتا کو اغوا کیا تھا یا ان کا تخت چھینا تھا مگر روایتی طور پر اسے ہندو ازم یا مذہبی داستان نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس سے درحقیقت صرف بدی کے مقابلے میں نیکی کی جیت ظاہر ہوتی ہے۔ رامائین سے غلط طور پر نتیجہ اخذ کر کے بعض ہندو یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اس وقت ان کے لئے اپنی طاقت منوانے کا موقع ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یونانی' منگول' ایرانی' مغل اور آخر میں انگریز اس لئے بار بار ہندوستان پر چڑھ دوڑے کہ مذہب کی رو سے ہندو جنگ و جدل کے عادی نہ رہے تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی لیڈروں نے سیکولرزم کے جوش میں مسلمانوں کو سر پر چڑھا لیا ہے۔ انہیں سابق روس کی اسلامی جمہوریاؤں کی طرف سے بھی خطرہ کا احساس ہے جس سے بھارت کی سلامتی متاثر ہو سکتی ہے جبکہ پہلے ہی بھارت دشمن اسلامی ممالک پاکستان' بنگلہ دیش اور افغانستان کے درمیان جنہیں پوری اسلامی دنیا کی پشت پناہی حاصل ہے' گھرا ہوا ہے۔ لہٰذا ہندو مت کے پر جوش پرچارک اسے اپنی ذمہ داری قرار دے رہے ہیں کہ طویل عرصے سے گم ہندو تہذیب کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ مانا کہ یہ بات غلط نہیں لیکن اس کا مطلب مسجدیں جلانا بھی نہیں۔ اس وقت جبکہ ہندوستان میں پہلے سے کہیں زیادہ نسلی ہم آہنگی اور رواداری کی ضرورت ہے' جنونی ہندو لیڈروں نے ایودھیا میں مسجد کو مسمار کر کے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

5156

ہندوستان کے ابتر معاشی حالات کو سہارا دینے کے لئے پر سکون ماحول کی ضرورت ہے تاکہ بیرونی سرمایہ کار یہاں آنے میں خطرہ محسوس نہ کریں مگر ان ضمیر فروش سیاستدانوں نے محض ذاتی مفادات کی خاطر وہ تمام مکروہ ہتھکنڈے استعمال کئے جن سے فرقہ واریت کی آگ بھڑکائی جا سکے۔ انہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ اس کے آئندہ چل کر کیا نتائج برآمد ہونگے۔ انہوں نے اپنے ذاتی' گروہی اور علاقائی مفادات کے چکر میں ایک ایسے وقت میں ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا ہے جب پہلے ہی حالات خراب تھے۔ پنجاب میں "خالصتان" کے لئے جنگ ہو رہی ہے' کشمیر میں مسلمان جنگجوؤں کے خلاف فوجی کارروائی کی وجہ سے وہاں کی معاشی حالت ناگفتہ بہ ہے۔

بھارتی سیاستدانوں نے اپنی مفاد پرستی میں بدامنی کو بڑھاوا دے کر فوج پر انحصار میں اضافہ کر لیا ہے جس سے دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ ادھر مسلمان ممالک میں بنیاد پرستی کی لہر سے بھارت کے مسلمانوں کو بھی شہ ملی ہے اور وہ سیکولر سیاست سے مایوس ہو کر اپنی عددی اقلیت کی پرواہ کئے بغیر ہندو جنگجوؤں سے ٹکر لینے کی سوچ رہے ہیں۔ دائیں بازو کے ہندوؤں کی جنگجوئی کا کم از کم ایک سبب سست معاشی ترقی بھی ہے کیونکہ بہت سے غریب ہندو یہ سمجھتے ہیں کہ سیکولر نظام میں ان کی بجائے مسلمان اور دوسری اقلیتیں فائدہ میں رہتی ہیں۔ کمزور مرکزی قیادت پر علاقائی سیاستدانوں کی بالا دستی سے بھی قومی سطح پر بے اطمینانی پیدا ہوئی ہے۔ معاشی' سماجی اور سیاسی ترقی کے لئے ایک امید افزا راستہ یہ ہو سکتا ہے کہ یہاں صدارتی نظام حکومت اختیار کیا جائے جو موجودہ پارلیمانی نظام کی نسبت تنگ نظری اور وقتی اتحادوں کی سیاست سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکے گا۔

پاکستان اور بنگلہ دیش کی مثالوں کو دیکھتے ہوئے تو کہا جا سکتا ہے کہ صدارتی نظام اس خطے کے لئے موزوں نہیں لیکن ہندوستان جیسے بہت بڑے ملک کے لئے جہاں کئی طرح کی تہذیبیں موجود ہوں' ایک حقیقی قومی قیادت فراہم کرنے کے لئے صدارتی نظام بالکل مناسب رہے گا۔ اس قسم کے ملک کے لئے جہاں ملی جلی نسلوں کے لوگ آباد ہوں اور کثیر تعداد میں زبانیں بولی جاتی ہوں' ایک مضبوط مرکز ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس طرح صحیح معنوں میں رام سے ہمارا تعلق بھی استوار ہوگا جس میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جن کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ وہ ایک مضبوط راہنما ہی نہیں' انتہائی خلوص سے کام کرنے والے اور تمام مذاہب سے رواداری برتنے والے انسان تھے۔ ○○